بہتے پانی میں عکس
منیر احمد شیخ

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

ضابطہ

۱۹۸۶ء
نیاز احمد
سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور
منظور پرنٹنگ پریس، لاہور
۵۰/۰۰ روپے

ترتیب

اُن شب و روز کے نام
جو اِس جہانِ رنگ و بُو میں بسر کیے۔

اے زمانے! تُو نے جو مجھے دیا، وہ تمہیں لوٹا رہا ہوں۔

مَیں اور میرا عکس

کئی مرتبہ یہ روایتی سا سوال مجھ سے پوچھا جاتا ہے کہ میں کیوں لکھتا ہوں؟ اس سوال پہ میرا پہلا ردِ عمل ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ سوال کرنے والا دراصل یہ پوچھنا چاہتا ہے کہ آپ کو کیا تکلیف ہے کہ آپ کاغذ قلم لے کے لکھنا شروع کر دیتے ہیں؟ اگر یہ کسی خوشی یا دکھ کے اظہار کے لئے کیا جاتا ہے تو اس سے کوئی بہتر راستہ کیوں اختیار نہیں کیا جاتا؟ لکھنا لکھانا تو منشی لوگوں کا کام ہے۔ دنیا میں سب لوگ تو جذبوں اور محسوسات کے اظہار کے لئے قلم لے کے دوڑ نہیں پڑتے۔ انہیں جب غصّہ آتا ہے تو وہ حریف سے بر سرِ میدان نپٹ لیتے ہیں۔ مار پیٹ کے یا قتل کر کے انتقام کے جذبے کو تسکین دے لیتے ہیں۔ خوشی کا موقع ہو تو شعر کہنے نہیں لگ جاتے، ناچنے بولنے اور گانے لگتے ہیں، یہ اظہارِ ذات کے نارمل طریقے ہیں مگر وہ غم و غصّہ کا اظہار ہو یا خوشی کا تو ادیب کاغذ قلم لے کے بیٹھ جاتا ہے اور اپنی نفرتوں اور خوشیوں کو لفظوں میں پرو کر یہ سمجھنے لگ جاتا ہے کہ اُس نے نہ صرف اپنے سینے کا بوجھ ہلکا کر لیا ہے بلکہ اس تجربے میں دوسروں کو بھی شریک کر لیا ہے۔ شاید اسی لئے بہت کم شاعر اور ادیب ایسے ہوئے ہیں جو مردِ میدان تھے۔ اقبالؔ کو بھی اس حقیقت کا اعتراف تھا کہ وہؔ کردار

کاغازی'' نہ بن سکا۔

میں نے کئی مرتبہ سوچا کہ آخر میں کیوں لکھتا ہوں؟ کس کے لیے لکھتا ہوں؟ کیا لکھنا ضروری بھی ہے؟ کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوا کہ لکھنے کا عمل زندگی سے فرار کا عمل ہے اور اپنی نااہلیت اور بُزدلی کو چھپانے کا ایک راستہ ہے۔ میرے افسانوں کے کرداروں میں بہت سے کردار ایسے ہیں جو میری زندگی میں آئے۔ اُن کے گھٹیا پن اور منافقت سے مجھے سابقہ پڑا۔ لیکن عملی زندگی میں میں اُن کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ اُن کے منہ پر کبھی گالی بھی نہ دے سکا اور اپنا سارا ردِ عمل اُن کرداروں کو لفظی صورت دے کر سمجھا کہ میں نے اُن کو "ننگا" کر دیا ہے۔ اُن کی اصل حقیقت سے دنیا والوں کو آگاہ کر دیا ہے اور دنیا والوں کو آگاہ کرنے کے بعد مجھے فتحیابی کا احساس ہونے لگتا ہے اور میں اپنے تیئیں ہواؤں میں اُڑنے لگتا ہوں۔ گویا میرا سارا غصّہ اور ساری خوشیاں "آگاہ" کر دینے کے عمل میں ہی اپنا اظہار کر دیتی ہیں۔ لیکن دیکھا جائے تو یہ کوئی اعلیٰ وارفع احساسِ لذت نہیں۔

بیشتر لکھنے والے انتہائی خود فریبی میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اِن سے بڑھ کر تخلیقی سرگرمیوں کا زُعم رکھنے والا کوئی دوسرا گروہ اتنا بر خود غلط نہیں ہوتا جتنا کہ یہ۔ لکھنے والے کے نزدیک اُس کا میڈیم، اظہارِ ذات یا اظہارِ کائنات (جو بھی کہہ لیجئے) کے لئے دوسرے تمام فنون سے اعلیٰ و معتبر ہے۔ وہ موسیقار ہو، مصوّر ہو، مجسمہ ساز ہو، ناچنے والا ہو، شاعر و ادیب کی نظر میں وہ ایسا مُعتبر نہیں جیسا کہ وہ خود کو سمجھتا ہے۔ خود فریبی کا سلسلہ یہیں پہ ختم نہیں ہوتا، لکھنے والے اپنے علاوہ کسی دوسرے کو دانش کا اہل بھی نہیں سمجھتے۔ میرا یہ سمجھنا بہت سے اہلِ قلم کو ضرور ناگوار گزرے گا۔ مگر میں صرف اپنے آپ کو سمجھنے کی کوشش میں یہ کہہ رہا ہوں۔

ع روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ۔ انسان کبھی تو تنہائی میں بیٹھ کر اپنے

کیے پر سوچتا ہے کہ وہ کیا کر رہا ہے؟ کیوں کر رہا ہے، اور کس کے لئے کر رہا ہے؟ میں خود کو اس فریب میں چاہوں بھی تو زیادہ دیر تک مبتلا نہیں رکھ سکتا کہ میں سچ کہنے کے لئے لکھتا ہوں، معاشرے کی اصلاح کے لئے لکھتا ہوں یا کوئی انقلاب برپا کرنے کے لئے لکھتا ہوں - ادب نے کبھی انقلاب برپا نہیں کئے۔ اس کی خبر اکثر حکومتوں کو بھی نہیں ہوتی۔ اُردو زبان کے نامور ادیبوں اور شاعروں سے جب کبھی بھی یہ سوال کیا گیا کہ آپ نے تخلیقِ ادب میں کیا کھویا کیا پایا تو ان میں سے اکثریت نے شعروادب میں نام کمانے کے باوجود اس کام سے بے اطمینانی کا اظہار کیا۔ عمر بھر لکھنے کے بعد جیسے انہیں عمر ضائع کر دینے کا احساس ہو۔ اُن کی باتوں سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ انہیں افسوس ہے کہ دنیا کو وہ جس طرح دیکھنا چاہتے تھے، وہ شعروادب کی تخلیق سے نہ بدل سکی۔ یہ مایوسی اپنی تخلیق سے ہے یا اس فن سے جس کے ذریعے وہ دنیا کو اپنا پیغام دینا چاہتے تھے۔ جو کچھ بھی ہے، لکھنے لکھانے کے کام کو وہ ایسا مشغلہ سمجھتے ہیں جو وہ اختیار تو کئے ہوئے ہیں مگر اُس کی افادیت سے چنداں مطمئن نہیں۔ غالبؔ نے بھی اس کام کو "شوقِ فضول" ہی کا نام دیا تھا تو کیا ادب کی تخلیق جھک مارنے کی بات ہے اور اگر ایسا ہی ہے تو کیا اُردو ادب کے علاوہ دنیا کی اور زبانوں کے ادیبوں کو بھی کوئی اسی قسم کا احساس ہے۔ جہاں تک میں جان سکا ہوں، ادیبوں کو احساسِ زیاں تو کم و بیش عمر بھر رہا مگر ادب کے ایک بیکار مشغلہ ہونے کا احساس کا اُردو ادب سے باہر کم ہی نظر آیا۔ ہمارے ہاں اس قسم کا احساس جس میں اپنے فن کی کم مائیگی غالب ہے اور مایوسی کا عنصر نمایاں ہے، ہمارے مخصوص تہذیبی تناظر ہی سمجھا جا سکتا ہے ہم لکھنے والے ایک اپنی ہی دنیا بسائے رکھتے ہیں اور جو کچھ لکھتے ہیں اُسے اپنی نظر میں تخلیق کا وہ اعلیٰ درجہ عطا کر دیتے ہیں جو ہماری تشنہ انا کی تسکین کے لئے مرہم کا کام کرتا ہے۔ اس معاملے میں شاعر لوگ تو بلندی کے اُس مقام پر پہنچے ہوتے ہیں

جہاں فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں مگر نثر نگار بھی ان سے کوئی زیادہ پیچھے نہیں ہوتے۔ ہمارے یہاں کے سماجی و تہذیبی پس منظر میں بدقسمتی سے شاعر، ادیب اور دوسرے فنکاروں کو معاشرے کا ایک غیر سنجیدہ گروہ تصور کیا جاتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ انہیں تفریح طبع کے سامان کے طور پہ ذرا سی اہمیت دی جاتی ہے۔ معاشرے کا یہ رویہ تہذیبی زوال کی علامت ہے یا قیامت کی نشانیوں میں سے کوئی ایک نشانی ہے، جو بھی ہے اس کا اثر ادیب اور معاشرے کی باہمی مخاصمت کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ اگر معاشرہ ادیب کی اہمیت سے باخبر نہیں ہے تو ادیب بھی معاشرے اور اس کی جھوٹی اقدار پر لعنت بھیجتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ لکھنے والا اپنے شیل (SHELL) میں گھس گیا ہے، جہاں وہ ساری دنیا کو گالی دے کر اور اپنے سے کمتر سمجھ کر اس نے اپنے آپ کو "محفوظ" کر لیا ہے اور اپنے گرد ایک حصار کھینچ لیا ہے۔

یہ صورتِ حال صرف ہمارے موقع پرست معاشرے میں ہے یا دنیا میں ہر جگہ اسی قسم کا رویہ خیال و حسن کے خالقوں سے روا رکھا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایسے معاشرے میں جہاں زندگی کو محض دولت یا طاقت کے پلڑوں میں نہیں تولا جاتا وہاں تخلیقی سرگرمی کو محترم سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ ایسے معاشروں کی پہچان فنی تخلیقات کے حوالے سے ہوتی ہیں اور لکھنے والے کو ایک فن کار کا مقام حاصل ہوتا ہے اور فنکار ہی تہذیب کا مظہر ہوتا ہے۔ جن معاشروں میں لکھنا لکھانا یا تخلیقِ فن کو احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، وہاں ادیب و فن کار ایسی خود فریبی میں مبتلا نہیں ہوتے۔ وہ اپنے مقام سے آگاہ ہوتے ہیں اور انہیں معاشرے کے اندر وہ اہمیت حاصل ہوتی ہے جس کے وہ مستحق ہوتے ہیں۔ انہیں نہ تو کسی شیل (SHELL) میں گھسنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور نہ وہ اپنے گرد کوئی حصار کھینچتے ہیں۔ ہمارے ہاں لکھنے والوں کی خود فریبی معاشرے کی اس طبقے سے بے اعتنائی کی وجہ سے ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہمارے بیشتر لکھنے والے تخلیقی ضرورت کے تحت کم اور اپنے وجود کو منوانے کے لئے زیادہ، لکھتے ہیں۔ ہماری زیادہ تر تحریریں تخلیقی سرگرمی بننے کی بجائے ایک بے حس معاشرے میں اپنی اہمیت جتلانے کا مسئلہ بن کے رہ گئی ہے۔

کیا پھر بھی وہ تکلیف ہے جس کے تحت ہم سب لکھتے ہیں؟ یا پھر ادب کی تاریخ میں اپنا نام چھوڑ جانے کا کوئی مسئلہ ہے؟ یا ادب کے نام پر تشہیرِ ذات مقصود ہے؟ یا کوئی مالی منفعت کی توقع ہے؟ لکھنے کے اُتنے ہی محرکات ہو سکتے ہیں۔ جتنے کہ لکھنے والے ہوتے ہیں۔ لیکن وہ محرک اب تقریباً ناپید ہو گیا ہے کہ جس میں نہ جاہ و طلب مقصود ہو، نہ اپنی انا کی غلط تسکین، نہ تاریخ میں نام چھوڑ جانے کی خواہش۔ مختلف محرکات ہو سکتے ہیں لیکن ایک سچّی اور کھری تحریر کومٹ منٹ کے بغیر نہیں لکھی جاسکتی۔ یہ کومٹ منٹ اوّل و آخر فن کے ساتھ ہوگی تو لکھنے والے کے پیٹ میں مروڑ اُٹھتے ہی رہیں گے اور وہ بغیر کسی خارجی محرک کے بار بار فن کی تخلیق میں پناہ لینے کے لئے مجبور ہوگا۔ یہ ایک ایسی ناگزیر صورتِ حال ہے۔ جو بالآخر مجبوری بن جاتی ہے۔ تخلیق کار چاہے بھی تو وہ خاموش یا بیکار نہیں بیٹھ سکتا۔ اُسے اپنے گرد کے حالات کے بارے میں کسی نہ کسی ردِ عمل کا اظہار کرنا ہوگا مگر یہ ردِ عمل سیاسی لیڈر یا خطیب یا سوشل ورکر کے ردِ عمل سے قطعی مختلف ہوگا۔ یہ ردِ عمل براہِ راست نہیں ہوتا، اس کی زبان بھی مختلف ہوتی ہے اور کہنے کا انداز بھی مختلف۔ یہی وجہ ہے کہ ادیب عوام النّاس تک اُس آسانی و کامیابی سے نہیں پہنچ پاتا جیسا کہ ایک سیاسی لیڈر۔ ان میں ایک اور فرق یہ ہے کہ ادیب وقتی اور عارضی صورتِ حال سے نہیں نپٹ رہا ہوتا، وہ تو اپنے حالات اور اپنے ماحول سے متاثر ہو کر ایسی باتیں کہے گا کہ جو اگر پوری سچائی اور شدت سے کہی جائیں تو وہ ابد کا حصہ بن جاتی ہیں۔ مگر کتنے ایسے ہیں جو سچ کو پوری طرح دکھا سکنے کی اہلیت و ہمت رکھتے ہیں؟ جو آدھا سچ بھی دکھا دیتا ہے، وہ

بھی بڑا کام کر دیتا ہے کہ باقی آدھا سچ پڑھنے والے خود تلاش کر لیتے ہیں ۔ مگر کیا ہماری اس طرح کی کوئی کومٹ منٹ اپنے قلم کے ساتھ ہے؟ اگر نہیں ہے ۔ تو پھر کوئی "ادبی ، سرگرمی" تخلیقی سرگرمی نہیں بن سکتی ۔

رہی یہ بات کہ لکھنا کیوں ضروری ہے تو اس کے بارے میں کسی خود فریبی میں مبتلا ہوئے بغیر یہ کہا جا سکتا ہے کہ لکھنے کا عمل دراصل خدائی عمل ہے ۔ خدا نے بھی اپنے اظہار کے لئے اسی ذریعے کو اختیار کیا ۔ الہام صحیفوں ہی کے ذریعے مخلوق تک پہنچا اور یوں حرف بندوں کے لئے معتبر ہوا اور لکھنا لکھانا ایک مقدس روایت کا حصہ بنا ہے

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

پس لکھنے کی سرگرمی قلم گھسیٹنے کی سرگرمی نہیں ۔ اس سرگرمی کو وقار اسی وقت ملتا ہے ۔ جب اس کے اندر مصلحت ، منافقت ، خوشامد اور ذاتی منفعت کی آلائشیں نہیں ہوں گی ۔ بصورتِ دیگر یہ محض تضیع اوقات ہے جس سے بہتر ہے کہ دنیا میں کوئی اور کام کر لیا جائے ۔

یہ چند تحریریں جو اگلے صفحات میں آپ دیکھیں گے کچھ ایسے سچ ہیں جن پہ جھوٹ کا گمان ہوتا ہے ۔ جس دور میں جھوٹ ہی سکہ رائج الوقت ہو ، اس دور میں سچ اور جھوٹ میں تمیز ختم ہو جاتی ہے ۔ پس اس جھوٹ سچ میں اگر کوئی لفظ ، کوئی جملہ آپ کی کسی حس کو ذرا سی دیر کے لئے جھنجھلا دے تو میں جانوں گا کہ یہ بے کار مشغلہ اکارت نہیں گیا ۔ میری تحریریں ہی میرا عکس ہیں ۔ میرا ہی چہرہ ان کے اندر آپ کو دکھائی دے گا ۔

شگون

نئے سال کے پہلے دن وہ کورا کاغذ اور نیا قلم لے کے اِس خیال سے کرسی پر بیٹھا کہ آج وہ کورے کاغذ پر ضرور کوئی لفظ لکھے گا۔ کورے کاغذ پر اُس صبح کوئی نہ کوئی تحریر لکھنے کی خواہش اسے رات ہی سے ہو رہی تھی۔ جس لمحہ سن ۶۴ آخری دم توڑ رہا تھا اور اگلے سیکنڈ سے سن ۶۵ چپکے سے سامنے آرہا تھا اور جب سن ۶۵ کے آخری سیکنڈ نے سن ۶۴ کا ورق اُلٹا تو اُسے یوں لگا جیسے کسی نے ایک کورا کاغذ اس کے سامنے رکھ دیا ہو۔ اُس نے سوچا کہ وہ اس کورے کاغذ پر کیا لکھے گا۔ پچھلے برس اُس نے کئی ایسی تحریریں لکھیں جو مقدّر کی سیاہی میں قید ہو کر وقت کے کورے کاغذ پر اپنے نقش نہ اُٹھا سکیں۔ یہ اَن لکھی تحریریں کسی نے پڑھیں نہ سُنیں۔ اُس نے سوچا آج وہ ان تمام تحریروں کو ضبط میں لائے گا تاکہ وہ ایک ابدی کیفیت سے باہر نکل کر زبان و مکان کی گرفت میں آجائیں اور وقت کا قصّہ یہ ہے کہ پاؤں تلے سے سرکتا ہی چلا جاتا ہے۔ کیا اُسے روکا نہیں جا سکتا۔ کیا کوئی ایسی حالت زندگی میں نہیں آسکتی جس کا نہ کوئی ماضی ہو، نہ حال، نہ مستقبل، ایک ایسی حالت جس میں وقت اور زمین کی طنابیں نہ ہوں۔ ابدیت کا ایک ایسا عالم جس میں ہونے نہ ہونے کا کوئی

احساس نہ ہو۔ لیکن اُسے فوراً ہی احساس ہوا کہ ابدی حقیقت کا سب سے بڑا پیڑ تو خود وقت ہی ہے، وقت جو ازل سے ابد تک جاری ہے، وقت جس میں ٹھہراؤ نہیں، ایک لمحے اور دوسرے لمحے کے درمیان کوئی توقف نہیں۔ ایک لمحے کو گرفت میں لے کر دوسرے لمحے کو کیونکر حکم دیا جا سکتا ہے کہ تو ذرا ٹھہر جا، ذرا سانس لے لے، لیکن اس نے سوچا کہ یہ توقف کیسے ہو سکتا ہے۔ بہتے ہوئے وقت کو کیسے روکا جا سکتا ہے۔ جسم اور روح کے رشتے کی طرح جب تک یہ دونوں مسلسل ساتھ چلتے رہتے ہیں تو زندگی سانس لیتی ہے لیکن جب دونوں میں سے ایک تھک کر ایک لمحے کے لئے رکتا ہے تو دوسرا اس کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ یہ موت ہے۔ جسم تھک جاتے ہیں۔ لیکن رُوح انہیں ستانے اور تازہ دم ہو کے چلنے کی فرصت کبھی نہیں دیتی۔ تو جس نے توقف کیا اُس نے زندگی کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا۔

زندگی جو ابدی ہے۔ ہمیشہ رہنے والی زندگی، زندگی جو وقت ہی کا دوسرا نام ہے۔ لیکن ایک وقت تو وہ ہے جو ہمارے ہاتھ کی لکیروں میں، کیلنڈروں کے اُوپر، اخباروں کے صفحوں کے اندر، سفید بالوں میں اور پژمردہ جسموں میں نظر آتا ہے۔ لیکن یہ سب بکواس ہے۔ بچپن، جوانی اور بڑھاپا یہ وقت نہیں، اصطلاحیں ہیں۔ دھوکا اور فریب ہے۔ زندگی کو سیکنڈوں، منٹوں، گھنٹوں، مہینوں، سالوں اور صدیوں سے نہیں ناپا جا سکتا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ پانچ سیکنڈوں میں تو زندگی ہے اور اس کے بعد کچھ نہیں۔ زندگی ہے اس لئے کہ بس ہے۔ بہتی ہوئی رواں دواں اور مسلسل، اس دنیا میں ایسے بچے بھی ہیں جو بوڑھے ہوتے ہیں اور ایسے بوڑھے جو بالکل بچے، اور ایسے جوان جن پہ کبھی جوانی نہیں آتی۔ اس کا کیا کیا جا سکتا ہے۔

لیکن ان تحریروں کا کیا ہوا جو کورے کاغذ پہ نہ اُبھر سکیں۔ لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ تحریر کورے کاغذ پہ ہی لکھی جائے۔ کورا کاغذ بھی تو بچپن، جوانی اور بڑھاپے

کی طرح ایک اصطلاح ہے ایک دھوکا۔ ایک فریب، یہ بھی تو ابد کا حصّہ نہیں اور وہ تو ایسی تحریر کی تلاش میں ہے ۔ جو سیاہی اور کاغذ کے رشتے کی مرہون نہیں ۔ یہ تحریر وقت کی اپنی تحریر ہے۔ اس تحریر کو کبھی ہوائیں لکھتی ہیں۔ صحراؤں کے کورے کاغذ کے اوپر۔ کبھی بہتے ہوئے رواں پانیوں کے اوپر کبھی ٹھہرے بند پانیوں کی سطح پر، کبھی سینوں کے اندر کہ جن کو کسی نے کھول کے نہیں پڑھا۔ آنکھوں میں جن کے اندر کسی نے جھانک کے نہیں دیکھا۔ سن ۶۵ء کا کورا کاغذ اُس کے سامنے ہے۔ وہ اِن تمام تحریروں کو اُس کاغذ پر کیسے منتقل کرے، اور اگر وقت کو لفظ کے راستے سے قید کرنا ہی اُس کا فن ہے تو جس بیچارگی کا احساس اُسے آج نئے سال کے پہلے دن ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ اُسے اگر زندہ رہنا ہے اور ابدی حقیقت کا حصّہ بننا ہے تو پھر اُسے کورے کاغذ پر کچھ نہیں لکھنا۔ اُن تحریروں کو پڑھنا ہے جن کے پیچھے ایک ہی قاعدہ ہے اور ایک ہی زبان ہے۔

اُس نے سوچا کہ وہ اس زبان سے آشنائی پیدا کرے جو ہر جگہ ایک ہے ۔ یہ زبان وقت کی زبان ہے اور اسے خیال ہوا کہ میں وقت ہوں اور وقت مجھ میں ہے اور جب ہم دونوں ہیں تو تحریر کے نقش سطحِ آب پہ سے اُٹھیں گے اور جب ہم جُدا ہوں گے تو دونوں گونگے ہوں گے اور وقت گونگا بھی ہو جایا کرتا ہے اور بہرا بھی۔ لیکن وقت کی آنکھ کبھی بند نہیں ہوتی اور سن ۶۴ء کی آنکھ کھُلی تھی۔ لیکن وہ گونگا اور بہرا تھا۔ وہ نہ خود بولا نہ کسی کو بولتے سُنا اور سن ۶۵ کے پہلے لمحے میں اُس کے اندر بجلی کوندی تھی کہ وہ سن ۶۵ء کو زبان دے گا کہ وہ کچھ کہے اور کان دے گا کہ کچھ سُنے۔

چنانچہ سن ۶۵ء کی پہلی کرن نے جب دھرتی کو چھوا تو وہ اُٹھا اور گرم پانی سے خوب غسل کیا۔ صاف ستھرے کپڑے پہنے، ایک پرانی سی خوشبو الماری کی

کسی دراز سے نکال کے کپڑوں پر لگائی۔ بالوں کو بڑے سلیقے سے سنوارا۔ عینک کے فریم کو اچھی طرح سے پالش کیا، شیشوں پر سے سن ۶۴ء کا گردو غبار ہٹایا اور کاغذ قلم لے کر کرسی پہ بیٹھ گیا۔ وہ سوچتا رہا کہ وہ ضرور کچھ نہ کچھ لکھے کہ آج کے روز لکھنا اچھا شگون ہے۔ سال کے پہلے روز ہاتھ پہ ہاتھ دھر کے بیٹھ رہنا اچھا نہیں۔ آج قلم اور کاغذ کا باہمی رشتہ ضرور پیدا ہونا چاہیے۔ کئی گھنٹے وہ اسی طرح سوچ میں پڑا رہا، کئی لمحے اور کئی زمانے اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گئے۔ کئی چہرے دھیان میں اترے اور گفتگو کر کے چل دیئے۔ کئی ایسی خوشبوئیں اُس کے نتھنوں کو چھُو کے گذر گئیں جنہیں اُس نے بچپن میں سونگھا تھا۔ گیلی مٹی کی خوشبو، کتاب کی خوشبو، پرانی دُھنوں کی خوشبو، ریلوے لوکوموٹیو انجن کے دھوئیں کی خوشبو، چیڑ کی خوشبو، پتھروں کی رگڑ سے پیدا ہونے والی خوشبو، اور جوان کنواریوں کے جسموں کی گرم اور بھینی خوشبو۔

اُسے محسوس ہوا کہ وقت اُس سے جُدا نہیں ہوا۔ وہ اُس کے اندر اُتر گیا ہے۔ ایک ایک تصویر اپنی خوشبو کے ساتھ اُس کے سامنے آتی، وہ اُس سے باتیں کرتا۔ اُس کی خوشبو سے اپنے وجود کا احساس کرتا اور ایک ایسی کیفیت میں گم ہو جاتا جس سے باہر نکلنے کو کسی کا جی نہ چاہے۔ اُسے وہ لڑکی یاد آئی، جسے اُس نے سکول کے زمانے میں دیکھا تھا۔ سُرخ سُرخ گالوں والی وہ ابھی بچّہ ہی تھا اور وہ ابھی اَدھ کھِلی تھی۔ اُس نے جب پہلی مرتبہ اُسے دیکھا تو وہ گھر سے باہر قدم رکھ رہی تھی۔ وہ اُسے بہت اچھی لگی۔ کوئی چیز زندگی میں اُسے اتنی اچھی نہ لگی تھی جتنی وہ۔ وہ اسے دیکھنا چاہتا تھا اُس کے پاس بیٹھنا چاہتا تھا۔ اُس کا دوست بننا چاہتا تھا۔ اُس کے سُرخ رخساروں کی گرمی اُس تک پہنچی تھی۔ اُسے یوں لگا کہ اُس نے زندگی میں پہلی مرتبہ روشنی دیکھی ہے۔ اس لڑکی کا مکان سب مکانوں سے جُدا اور اس کی ایک ایک اینٹ میں اُس کا عکس تھا۔ کئی بار اُس نے اینٹوں کو ہاتھ لگایا اور ہر بار ہاتھ لگاتے وقت وہ اُس

کے پھول جیسے جسم کی حرارت کو محسوس کرتا۔ اُس نے اِن اینٹوں سے باتیں کیں۔ وہ اینٹیں اینٹیں نہیں تھیں۔ اُس کے حال سے واقف تھیں۔ وہ اینٹوں سے ہم کلام ہوتا اور پوچھتا کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔ کس کمرے میں ہے۔ کیا سوچ رہی ہے۔ وقت کی دیوار اُس کے درمیان سے اُٹھ جاتی اور وہ ہوا کی تحریر کو پڑھتا۔ ہوا جو اُس کے بالوں سے کھیلتی تھی اور اُس کا پیغام اُس تک لاتی تھی۔ سُرخ گالوں والی وہ لڑکی آج پتہ نہیں کہاں اور کس حال میں ہے۔ لیکن وقت کے لمحے کو اس لڑکی نے وہیں روک دیا ہے۔ وہ لمحہ آج بھی کئی برس گذرنے کے بعد اپنی جگہ پر کھڑا ہے۔ سن ۶۵ء کے پہلے دن وہ اُسی طرح سامنے آئی ہے۔ تازہ تازہ کھلی ہوئی نرم اور گداز۔ روشنی ہی روشنی۔ اس کے مکان کی اینٹوں سے اُس کی مہک نتھنوں سے چھو کر گذر رہی ہے، وہ گھر کے نہ جانے کونسے کمرے میں بیٹھی پتہ نہیں کیا سوچ رہی ہے۔ ہوا کی تحریر سینے پر ایسی نقش ہے کہ مٹائے نہیں مٹتی اور محبت کی وہ دھیمی آنچ جو اُس نے سینے میں سُلگائی تھی آج بھی اُس میں سے چنگاری اُٹھتی ہے۔ وقت پہلے آزاد تھا نہ ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں۔ لیکن اُس شعلہ رُخ نے اُسے پابند کر دیا۔ اُس نے سوچا کہ وقت کو کون قید کر سکتا ہے۔ محبت کا لمحہ توان لکھی تحریر ہے جو لفظوں کی قید میں نہیں آسکا۔ لیکن اپنی جگہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ٹھہر گیا ہے۔ جس روز یہ لمحہ لفظوں کی گرفت میں آگیا اس روز وہ کہہ سکے گا کہ وہ کورے کاغذ پر سیاہی سے حروف نہیں بناتا۔ وہ ہواؤں کو چلاتا ہے اور اُن سے باتیں کرواتا ہے۔ رواں اور ٹھہرے ہوئے پانیوں کی سطح پہ نقش بناتا ہے۔ پرانی خوشبوؤں کو جب چاہتا ہے حاضر کر لیتا ہے۔ کنواریوں کے جسموں کی گرم اور بھینی خوشبو آج بھی اُسی پہلی خوشبو کی طرح تازہ ہے جو اُس نے بچپن میں سونگھی تھی۔ لیکن وقت گھڑیوں، کیلنڈروں اور جنتریوں میں قید نہیں کیا

جا سکتا اور نہ لفظوں کی تحریر کی زنجیریں اُس کے پاؤں میں ڈالی جا سکتی ہیں۔ یہی سوچتا سوچتا وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ ایک وحشت سے اُس نے کورے کاغذ کو پھاڑ ڈالا اور قلم کو زمین پر پھینک دیا۔ اُس نے نئے سال کے پہلے روز کوئی لفظ اُس کاغذ پر نہ بنایا۔ لیکن اُسے آج کچھ نہ کچھ تو ضرور لکھنا چاہیے۔ یہ اچھا شگون ہوگا۔ وہ اُٹھا اور چھت پر چڑھ کر آسمان کے ٹھنڈے اور نیلے رنگ کو دیکھا۔ نیلی دُھوپ میں ایک سانولی سی لڑکی منڈیر سے لگی کھڑی تھی۔ اُس نے بالوں میں سفید گلاب کا تازہ پھول لگایا ہوا تھا۔ اُس نے اس لڑکی کی طرف دیکھا نئے سال کی ٹھنڈی نیلی دھوپ میں وہ گلاب کی تازہ شاخ کی طرح منڈیر پر جھکی ہوئی تھی۔ اُسے یکلخت احساس ہوا کہ وقت اُس کے پاؤں کے نیچے سے سرکتا جا رہا ہے۔ بے اختیار ہو کر اُس نے سانولی لڑکی کو ہوا کے دوش پہ اپنے پیار کی آنچ نہ بھیجی۔ ٹھنڈی ہوا ذرا سی دیر کے لئے گرم ہو گئی اور بالوں میں سجا ہوا سفید پھول سُرخ گلاب میں بدل گیا۔ دل کی ایک خواہش جو زبان پہ آئی تھی۔ ہوا نے اُسے چُن لیا تھا۔

نئے سال کے پہلے روز یہی ایک جُملہ تھا جو اُس نے ہوا کے ماتھے پہ لکھا۔

کھارے پانی کا بندہ

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب نانی اماں حج سے واپس لوٹ کر صحن میں پیڑھی پر جم کر بیٹھ جاتیں اور رسول پاک کی گلیوں کے ملیے قصے چھیڑ دیتیں۔ پھر جب کوئی صحن کے فرش پر پانی سے بھری ہوئی بالٹیاں دھڑا دھڑ انڈیلنے لگتا تو نانی اماں پانی کو اس طرح بے تحاشا بہتا ہوا دیکھ کر ہونٹوں پہ اُنگلی رکھ کے بڑی دُکھ بھری آواز میں کہتیں: "پانی کو اس بے دردی سے نہ بہاؤ۔ عرب شریف میں تو لوگ قطرے قطرے کو ترستے ہیں۔ تمہیں پانی کی کیا قدر؟"

نانی اماں کا یہ دُکھ سن کر میں گہری سوچ میں ڈوب جاتا اور اُٹھتے بیٹھتے یہ تجویز میرے ذہن میں بار بار آتی کہ کوئی ایسا سبب بنے کہ میں رسولِ پاکؐ کے وطن جا کے گھر گھر پانی کے نلکے لگا دوں اور میرے نبیؐ کی زبان بولنے والے اور اُن کے جمّے جائے رَج رَج کے پانی پئیں اور اپنے صحنوں میں بیٹھ کر خوب نہائیں دھوئیں۔ میں اُن دنوں چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا اور نانی اماں مکّے سے مدینے اونٹوں پر سوار ہو کر سفر کرتی تھیں۔ ان کا قافلہ پندرہ دنوں کی طویل مسافت کے بعد ریتلے

سمندروں میں سے گزرتا رسول پاکؐ کے در پر پہنچتا۔ نانی اماں بتلاتیں کہ کئی مرتبہ رات کے اندھیرے میں اُن کے قافلے پر قزاق حملہ آور ہوتے اور قافلے کا سب سازوسامان لوٹ کے لے جاتے اور زادِ راہ سے بھی محروم کر دیتے۔ مگر حُبِّ رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم اُن کے سفر کے عزم کو ذرا بھر کمزور نہ کرتی اور مدینے کی گلیوں کی دلکشی کسی طور کم نہ ہو پاتی۔

عرب شریف کے گھروں میں نلکے لگانے کی خواہش کا اظہار ایک روز میں نے اپنی ماں سے کیا تو اُس نے بتلایا کہ نبی پاکؐ کی سرزمین تو ریتلی ہے اور اُس میں سے پانی نکالنا بہت ہی مشکل کام ہے۔ دو دو سو فٹ زمین کھودیں تو بہت نیچے کہیں جا کر پانی کا گمان ہوتا ہے۔ اُنہیں دنوں میں نے خواب میں کئی مرتبہ دیکھا کہ میں ربڑ کی بڑی سی ٹیوب میں ہوا بھر کے اُس پہ بیٹھا سمندر کے راستے مدینے کی طرف جا رہا ہوں اور میرے ہاتھ میں نلکے والی مشین ہے۔ یہ خواب ایک مرتبہ نہیں کئی مرتبہ دکھائی دیتا اور جب میری آنکھ کھلتی تو نہ رسول پاکؐ کی گلیاں ہوتیں اور نہ ہی میرے ہاتھوں میں نلکے والی مشین۔ مجھے اپنی بے بسی پر بہت رونا آتا۔ مجھے خدا پہ سخت غصہ آتا کہ وہ اُس پاک سرزمین پہ کیوں مینہ نہیں برساتا۔ خدا کو اتنی سائنس بھی نہیں آتی کہ وہ وہاں مینہ برسا سکے؟

اور اُنہی دنوں غلام حسین کے بینڈ جنڈیالے باغ والے جانے کا اتفاق ہوا اور وہاں میں نے عالم لوہار سے جوڑی کی سنگت میں مرزا صاحباں سُنی اور گاؤں کے مولوی صاحب کا وعظ۔ جمعہ کی نماز سے پہلے ہم نے مسجد کی کھوئی میں سے بوکے بھر بھر کے سکا وے پانی سے لبالب بھر دیئے۔ پانی کا بوکا نکالنے کے بعد ہمیں لگتا کہ ہر بوکے کے ساتھ ہمیں جنّت میں ایک مرلہ زمین الاٹ ہو رہی ہے۔ غُسل وُسل کرنے کے بعد جب جمعے کا وعظ مُبارک شروع ہوا تو مولوی صاحب نے وعظ کے درمیان ایک مقام

برسایا۔

"لو! اب ایک نئی بات سننے میں آئی ہے۔ یہ سائنس دان آج ہمیں ایک نئی بات سنانے لگے ہیں۔ یہ ہمیں بتلا رہے ہیں کہ مینہ کیسے برستا ہے؟ یہ کہتے ہیں (اور یہ ذرا دھیان سے سننے والی بات ہے!) ہاں یہ کہتے ہیں کہ سورج سارا دن سمندر پر شعاعیں پھینکتا رہتا ہے۔ ان شعاعوں کی تمازت سے سمندر کا پانی گرم ہو جاتا ہے اور اس سے بھاپ اٹھنے لگتی ہے جو اوپر جا کر بخارات میں بدل جاتی ہے۔ پھر یہ بخارات بلندی پر بارش کی شکل میں گرنے لگتے ہیں۔" اتنا کہنے کے بعد مولوی صاحب کا چہرہ سرخ ہو گیا اور انہوں نے کڑک دار آواز میں کہا کہ "ان سائنس دانوں سے پوچھو کہ جب سائنس نہیں ہوتی تھی تو مینہ ان کا باپ برسایا کرتا تھا؟"

مولوی صاحب کی بات بالکل سیدھی صاف تھی اور اس میں کوئی پیچ نہیں تھا۔ یہ بات ہر ایک کی سمجھ میں فوراً آ گئی اور جی میں بھی اتر گئی۔ اس روز مجھے پتہ چلا کہ خدا کے کاموں میں کوئی سائنس نہیں ہے۔ اس کے جی میں آئے تو زمین پر چھاجوں پانی برسانا شروع کر دیتا ہے اور اگر اس کا جی نہ چاہے تو اپنے پیارے نبیؐ کی زمین کو پیاسا رکھتا ہے۔ اس دن کے بعد خدا پر پھر مجھے کبھی غصہ نہ آیا۔ لیکن میری وہ خواہش میرے ساتھ ہی چمٹی رہی کہ میں ریتلی زمین میں سے پانی نکال کے دکھاؤں۔

پھر جب میں ذرا بڑا ہوا اور صوفیاء کا کلام میرے کانوں میں پڑا تو مجھے معلوم ہوا کہ ریتلی زمین پر ایک دفعہ مینہ کا ایک قطرہ گرا تھا تو اس ریت میں سے آواز آئی۔ "اچیاں لمیاں لال کھجوراں تے پتر جنہاں دے ساوے" اور ساوے پتوں کے نیچے سے نکلی ہوئی یہ آواز کوک بن کر بنوں اور جنگلوں میں چاروں جانب پھیل گئی اور ٹھنڈی کھوئی پہ بیٹھے ہوئے اک سائیں کو یوں لگا کہ اس کے سینے کے اندر ایک اونچی لمبی لال کھجور اگ آئی ہے۔ اس نے اپنے حقے پر لگا ہوا پیتل کا تار اتارا اور اسے بانس کی

ایک پتلی سی لکڑی کے اوپر چڑھا کر اس کا دوسرا سرا ایک سوکھے ہوئے خالی کدو کے اوپر باندھ دیا اور پوہ ماہ کی سردی میں بہتے ہوئے پانی میں ٹانگیں ڈال کر اُس تار کو بجانا شروع کر دیا۔ سائیں کا مُنڈا ہوا سر اور خشک کدو، سائیں کا کمزور لمبا جُثّہ اور لکڑی پر چڑھی ہوئی لمبی تار، سائیں کی سانس اور تار کی جُنبش سے ہوا میں ارتعاش۔ سائیں اور اُس کا ہمزاد ایک دوسرے کے سامنے آن کھڑے ہوئے۔ اُنہوں نے ایک دُوسرے کو پا لیا۔ اُن دونوں میں سے ایک سچا سائیں تھا اور دوسرا جھوٹا۔ جو سچا سائیں تھا وہ اِک تارا بجاتا بجاتا، تار کی طرف دیکھنے لگ جاتا اور اس کی آنکھیں پھٹی پھٹی سی دکھائی دینے لگتیں اور جب کوئی پوچھتا کہ "سائیں جی! یہ کیا بجاتے ہو؟ تو سائیں مُسکرا دیتا اور ہمیشہ یہی کہتا۔ "میں تو کچھ بھی نہیں بجاتا۔ بس اِس تار کو سمجھاتا ہوں، یہ سمجھتی ہی نہیں"۔ اور جب تار کو کچھ کچھ سمجھ آنے لگی تو سائیں کی اپنی سانس کی ڈوری ٹوٹ گئی۔ سائیں نے ٹوٹتی ہوئی سانس کے درمیان اپنے اِکتارے کی طرف دیکھا اور کہا: "جھوٹے سائیں کو سچے سائیں نے بھگا دیا ہے۔ اس تارے نے میرا سارا مَیل نکال دیا ہے۔ آج سے میں اور میرا تارا ایک ہو گئے ہیں۔ جب مجھے قبر میں ڈالنا تو میرے تار کو میرے ساتھ ہی لٹا دینا۔ قیامت کے روز ہم اکٹھے ہی اُٹھیں گے"۔

لوگوں کو یہ کہتے اکثر سنا گیا ہے کہ اندھیری راتوں میں کبھی کبھی سائیں اکتارے کی صورت میں نظر آتا ہے اور کبھی کبھی اکتارے پہ سائیں کا گمان ہونے لگتا ہے۔ مرنے سے کچھ دیر پہلے سائیں کا جسم سوکھ کر ایک تار بن گیا تھا اور اُس کے جسم اور تار کے درمیان سب فرق مِٹ گیا تھا۔

ایک دن ایک خوبصورت عورت کو سامنے بیٹھے ہوئے دیکھا تو بس اُسے دیکھتے دیکھتے بُت بن گئے۔ پاس ہی بیٹھے ہوئے ایک صاحب نے جو یہ کیفیت

دیکھی تو اُن کا کندھا ہلا کر کہا ، "سائیں جی ! بس اب جانے دیجیے ۔ اللہ اللہ کیا کیجیے ۔"
یہ سنا تو ہنس دیے اور کہا : ابھی تو میں بندہ بندہ کرتا ہوں ۔ اس سے گزروں گا تو پھر اللہ کی باری آئے گی ۔"

"بندہ بندہ" کرتے کرتے سائیں جی تو ابد ہو گئے اور اُدھر اخباروں میں یہ خبر آئی کہ عرب شریف میں ریت کے نیچے سے تیل نکل آیا ہے ۔ اتنا تیل کہ اگر ساری دنیا بھی اُس سے نہائے تو بھی ختم ہونے پر نہ آئے ۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے یہ پیتل سُونے میں بدل گیا ۔ وہ جو پانی کے قطرے کو ترستے تھے ۔ اُن کے قدموں کے نیچے سونے کی نہریں بہنے لگیں ۔ عرب شریف میں بسنے والوں نے اپنے دانت بھی سونے کے لگوا لیے ۔ اب وہ ہنستے بھی ہیں تو اُن کے منہ میں دانتوں کی بجائے سونا کھڑ کھڑ ہنستا ہے ۔ اُن کے عقیدوں پر بھی سونے کا پانی چڑھ گیا ہے اور اُن کی چمک آنکھوں کو چُندھیا دیتی ہے ۔

اور میں جو بچپن سے عرب شریف میں پانی نکالنے کی فکر میں پریشان رہا اُس کے اپنے صحن کے نلکے کا پانی کھارا ہو گیا ۔ اب یہ نہ گلے کے نیچے سے اُترتا ہے اور نہ میل نکالتا ہے ۔ میں نے مستری کو بُلوا کے کہا کہ یہ پانی اب ہمارے کسی کام کا نہیں ۔ اس نے مشورہ دیا کہ اگر میٹھے پانی تک پہنچنا ہے تو زمین میں اور گہرے جاؤ ۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ عرب شریف میں غیر لوگ زمین کے نیچے بہت گہرے چلے گئے تو سونا لے کے اُوپر آگئے اور مجھے یقین نہیں کہ اگر میں اپنی زمین میں دُور تک اُتر گیا تو کیا مجھے پانی کا قطرہ بھی ملے گا یا نہیں ؟ خُدا پر مجھے غصہ آنا بند ہو گیا ہے ۔ مجھے لگتا ہے کہ خُدا کے ساتھ اب اُس کی سائنس بھی فیل ہو گئی ہے نہیں نہیں مسجد کے میاں جی نے تو کہا تھا کہ رحمت کے پیچھے تو کوئی سائنس نہیں ہوتی ۔

ہاں مجھے یاد آیا کہ نانی اماں یہ بھی کہا کرتی تھیں کہ حشر کے روز ہم اپنے جیسوں

کے ساتھ ہی اُٹھائے جائیں گے۔

——— تو پھر ٹھنڈی کھوئی والا سائیں اِکتارے کے ساتھ اُٹھے گا،

——— اور رانجھا ہیر کے ساتھ،

اور میں؟ جو بچپن سے پانی والی مشین ہاتھوں میں تھامے عرب شریف جانے کے خواب دیکھتا رہا، میں کس کے ساتھ اُٹھایا جاؤں گا؟

جنڈیالے باغ والے مولوی صاحب آج زندہ ہوتے تو میں اُن سے پوچھتا "میاں جی! یہ بتلائیے کہ جو اس جہان میں کھارا پانی پیتے پیتے مرجائیں کیا اگلے جہان میں انہیں میٹھا پانی پینے کو ملے گا؟ آپ کی سائنس کیا فرماتی ہے بیچ اس مسئلے کے؟"

۹ر دسمبر

شام کو ایک لمبی سیر کے بعد جب میں گھر میں داخل ہوا تو میری میز پر ایک وزیٹنگ کارڈ پڑا ہوا تھا۔ جس کی پشت پر یہ جملہ لکھا ہوا تھا "میں انٹرکانٹی نینٹل کے کمرہ نمبر ۲۳۲ میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ افسوس کہ آپ سے گھر پہ ملاقات نہیں ہوسکی۔ میں صرف تین دن کے لئے یہاں آیا ہوں۔ آپ کا منتظر رہوں گا۔"
میں نے کارڈ کو اُلٹ کے دیکھا تو اُس پر لکھا تھا کُک (cook) میں مخمصے میں پڑ گیا کہ یہ کُک کون ہے؟ میں تو کسی کُک کو نہیں جانتا اور پھر یہ میرے گھر کیسے پہنچ گیا؟ نئے ناموں اور نئے لوگوں سے میں ویسے ہی خوف زدہ ہوتا ہوں۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے تعلقات کا دائرہ پھیلنے کے ساتھ میں اس کی وسعت میں کھو جاؤں گا اور اپنے آپ سے میرا تعلق کمزور ہوتا جائے گا اور میں پھر ایک روز اُس شخص کی مانند ہو جاؤں گا جس کی زندگی کا مقصد صرف سوشل لائف گزارنا رہ جاتا ہے۔ وہ اپنی تنہائی کا علاج دوسروں میں ڈھونڈتا پھرتا ہے مگر ہر دوسرے شخص سے ملنے کے بعد اپنے آپ کو اور تنہا پاتا ہے اور پھر سینکڑوں اور ہزاروں

ہجروں کے سمندر میں اُس کا اپنا چہرہ بھی گم ہو جاتا ہے ـــــ اپنے آپ سے بھاگنے کی سزا ـــــ بڑھتی ہوئی ویرانی اور پھر یہ ویرانی پوری شخصیت کو کھوکھلا کر دیتی ہے۔ آدمی ہر ایک کا واقف تو ہو جاتا ہے مگر رشتے کی کوئی گہرائی ان سوشل ملاقاتوں سے جنم نہیں لے پاتی۔ اُوپر اُوپر کے قہقہے اور اوپری باتیں آدمی کو بالآخر بے یقین بنا دیتی ہیں اور وہ کمزور ہو جاتا ہے۔ میرا مسئلہ تو یہ ہے کہ جو چند لوگ میری زندگی میں اب تک آ چکے ہیں اور جنہوں نے میرے دُکھ سُکھ میں میرا ساتھ دیا ہے میری سانسوں میں جن کی سانسیں شامل ہیں اور میرے قہقہوں اور میرے آنسوؤں میں جن کی محبت کی چمک ہے۔ میں انہی مختصر سے لوگوں کے ساتھ اپنی زندگی کے رشتے کو اور گہرا اور مضبوط کرتا چلوں اس لئے کہ ان لوگوں کے ساتھ میں نے اپنی زندگی کے کئی برس گزارے ہیں۔ ان کے اور میرے درمیان وقت کا آہنگ ہے اور زندگی کے زیر و بم میں یوں رواں ہیں جیسے سُر اور تال باہم مل کے چلتے ہیں۔ مگر یہ گک کون ہے؟ ظاہر ہے کوئی پاکستانی تو ہرگز نہیں۔

میں نے ذہن پر زور دیا۔ تین برس پہلے جرمنی کے خوبصورت اور قدیم شہر کولون میں گک سے ملاقات ہوئی تھی۔ اُس شام اس کی بیوی کی سالگرہ تھی اور اُس نے مجھے بھی آنے کی دعوت دی تھی۔ وہ شام بہت خوبصورت تھی۔ چھوٹے گول پتھروں سے نصب گلیوں میں سے گزرتا ہوا میں اس کے فلیٹ پر پہنچا تھا۔ دروازے پر اس کی بیوی زبینہ سالگرہ کا خوبصورت ریشمی جوڑا پہنے اور بال بنائے میری منتظر تھی۔ گک نے میرا تعارف کرایا۔ زبینہ نے مسکراتے ہوئے مجھے خوش آمدید کہا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے مسکراتے ہوئے لبوں کے ساتھ اُس کی بڑی بڑی روشن آنکھوں کی پتلیاں بھی مسرت سے پھیل گئی تھیں اور میں ایک لمحے کے لئے روشنی اور مسرت کی

اس گہری اتھاہ میں ڈوب گیا تھا۔ اُس نے میرا ہاتھ تھاما اور اندر چلنے کو کہا۔ وہاں تین چار مہمان پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں ایک ادھیڑ عمر کی عورت تھی جسکے چہرے پر جھرلوں کا جال تنا ہوا تھا اُسنے میرا ہاتھ تھاما اور اندر چلنے کو کہا وہاں تین چار مہمان پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ اتنی بوڑھی تھی نہیں جتنی چہرے سے نظر آ رہی تھی۔ دوسری جنگ عظیم میں اس کا سارا گھر بار تباہ ہو گیا تھا اور ان صدموں اور زندگی کی شدید جدوجہد نے اس کے چہرے پر تفکرات کا ایک جال سا بن رکھا تھا اور اُس کا اصلی چہرہ ان سب لکیروں کے کہیں پیچھے ہی چھپ گیا تھا۔ دوسرا شخص ایک پاکستانی تھا جو پچھلے پندرہ بیس برس سے جرمنی ہی میں رہ رہا تھا۔ مگر اتنے برس کی جدائی کے باوجود وہ جب بھی کوئی بات کرتا اپنے وطن پاکستان کے بارے ہی میں کرتا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ اس مختصر سی ملاقات میں پاکستان کے بارے میں سب کچھ ہی جاننا چاہتا ہے۔ اس کے اضطراب اور بے قراری سے میں نے انداز لگایا کہ اپنوں سے مسلسل دُوری نے اس کا سکھ چین چھین لیا ہے۔ اس کا اضطراب اور بے چینی ایک ایسی سزا لگتی تھی جو ہر اس شخص کا مقدر ہے جو اپنے آپ سے بھاگتا پھرتا ہے مگر اُسے کہیں سکون نہیں ملتا۔ دو اور شخص تھے۔ یہ بھی جرمن ہی تھے۔ بالکل خاموش اور چُپ چاپ، ان کے چہرے مہرے میں بھی کوئی ایسی نمایاں بات نہ تھی کہ وہ توجہ کا مرکز بنتے۔ ہم سب رات گئے تک مشروبات پیتے اور باتیں کرتے رہے۔ کلک کو میں نے ایک نہایت شستہ اور مہذب آدمی پایا۔ اُس نے انگریزی ادب میں ڈاکٹریٹ کر رکھی تھی اور جرمن فلسفے اور ادب پر اس کی گہری نظر تھی۔ وہ ایک قدآور آدمی تھا اور اس

کے تیکھے نقوش اور تیز آنکھوں نے اس کے چہرے میں عقابی صفات پیدا کردی تھیں۔ باتیں کرتے وقت وہ آنکھوں کو مسلسل گھماتا رہتا۔ جیسے اس کی ساری روح آنکھوں ہی میں کھینچ آئی ہو مگر اس اضطرابی کیفیت میں اس کی ذہانت برابر جھلکتی رہتی اور وہ ہر بات کا بڑا تول تول کر جواب دیتا۔

میں نے سیاست کا موضوع چھیڑا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ اس موضوع پر گفتگو کرنے سے اجتناب کرتا ہے۔ وہی نہیں محفل میں بیٹھے ہوئے دوسرے جرمن بھی اس موضوع پر چنداں خوش نظر نہ آئے گویا میں نے کوئی ناگوار سی بات کردی ہو اور ایک ہلکی پھلکی محفل کو بوجھل بنادینے کی کوشش کی ہو۔ سیاست پر گفتگو کرنا یوں تو میرا بھی دل پسند مشغلہ نہیں مگر مجھے یہ جاننے میں دلچسپی ضرور تھی کہ ایک قوم جو ایک بہت بڑی جنگ ہار چکی ہے اپنے قومی مستقبل کو کس طرح سے دیکھتی ہے اُس کا سیاسی وجود کس حد تک برقرار رہتا ہے اور کیا وہ اس سیاسی وجود کو برقرار رکھنے میں کوئی دلچسپی بھی رکھتی ہیں یا نہیں؟

میں نے چٹکی لیتے ہوئے کہا "مجھے یوں لگتا ہے کہ آپ کو اپنے سیاسی وجود سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں"۔

"سیاسی وجود؟" گک نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔ "سیاسی وجود سے آپ کی مراد قومی وجود ہے تو ہم ایک قوم کی حیثیت سے تو اب بھی زندہ ہیں"۔

"وہ کیسے؟"

"اُس لئے کہ گوئٹے، بیتھوون، موزارٹ، شلر اور باخ آج بھی زندہ ہیں اور ہم اُنہی کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں"۔

"لیکن ایک اور حوالہ بھی تو ہے؟" میں نے اسے ٹوکا۔

"کونسا؟"

"ہر ہٹلر اور اس کی نازی جماعت"۔

"اُف خدا کیلئے یہ نام مت لو، یہ تو جنونی اور پاگل لوگ تھے۔ جرمن نیشنل ازم کے نام پر انہوں نے ہماری نسلیں ہی برباد نہیں کیں، دنیا میں ہمارا امیج ایک ظالم اور درندہ انسان کا بنا دیا"۔

"نیشنل ازم اتنی بُری چیز ہے کیا؟"

"جی ہاں سیاسی نیشنل ازم اولادِ آدم کے لئے زہرِ قاتل ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ اس نیشنل ازم کے نام پر کتنا خون بہا"۔

"اور مذہب؟ کیا اس کے نام پر خون نہیں بہا؟"

"کیوں نہیں سیاسی بلیک میل اور نفرتوں کو اُجاگر کرنے میں اسے ہمیشہ استعمال کیا جاتا رہا ہے"۔

"مذہب اور نیشنل ازم سے بغاوت کہیں احساسِ شکست کا نتیجہ تو نہیں؟"

"نہیں ہرگز نہیں۔ ہم نے نسلِ انسانی کی بڑی تباہی و بربادی دیکھی ہے اور ہم آگ اور خون کے اس کھیل کے پس پردہ تمام قوتوں سے بخوبی واقف ہو چکے ہیں۔ اب ہم صرف چین اور سُکھ سے رہنا چاہتے ہیں۔ ہمارا وجود، ہمارا تہذیبی وجود آج بھی زندہ ہے اور اسے زندہ رکھنے کے لئے ہم تگ و دو کرتے رہیں گے"۔ یہ کہتے ہوئے گٹ نے بیئر کا ایک اور گلاس لکڑی کے بڑے مٹکے سے بھرا اور میری طرف دیکھ کے مسکرایا "اے میرے اجنبی دوست، تم بڑے اچنبھے میں پڑ گئے ہو میں نے کوئی ناگوار بات تو نہیں کی"۔

"نہیں نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ بس میں یونہی کسی سوچ میں پڑ گیا ہوں۔ اچھا اجازت دیجیے۔ پھر ملیں گے۔ آؤف ویدر زہن گوٹے نخت، شب بخیر"۔

زبینہ اور گُک دروازے تک مجھے خوش آمدید کہنے آئے۔ رخصت ہوتے وقت میں نے زبینہ کا ہاتھ اپنے دائیں ہاتھ میں لے کے اپنے ہونٹوں سے چھُوا۔ اس کی ملائمت اور خوشبو سے مجھے یوں لگا جیسے میں عدم سے یکایک وجود میں آگیا ہوں اور میری زندگی کی حرارت اسی نرمی اور خوشبو کی مرہونِ منت ہے۔ ایک لمحے کے لئے مجھے کمرے میں ہونے والی ساری بحث بے معنی سی لگی کہ جس میں ہم سیاسی اور قومی وجود کی تلاش میں سر کھپا رہے تھے۔ زبینہ کی آنکھوں میں وہی چمک تھی جو ایک خوبصورت عورت کے یہاں حُسن کا خراج وصول کرتے وقت پیدا ہوتی ہے۔ اُس کی گردن غرور سے تن گئی۔ اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اُس نے مجھے گرمجوشی کے ساتھ شب بخیر کہا۔

واپسی پر میرے ذہن میں خیالات کا ہجوم تھا۔ وہ باتیں جو گُک کے کمرے میں ہوئی تھیں۔ اُن سے ایک تلاطم سا برپا ہو گیا۔ مجھے وحشت سی ہونے لگی تھی۔

کولون خوشبوؤں اور تشنہ آرزوؤں کی تکمیل کا شہر، شب کی روشنیوں میں میرے سامنے پھیلا ہوا تھا۔ فٹ ہاتھ پر چلتے چلتے مجھے ایک دم خیال سا آیا کہ ایک مدت سے آسمان پر ستارے نہیں دیکھے۔ میں نے نظریں آسمان کی جانب اُٹھائیں مگر وہاں آسمان کی جگہ روشنی کا ایک دبیز سا غبار تھا۔ یہ غبار میں ہر شب دیکھتا تھا۔ ہاں جب ایک رات بادل کھُل کے برسے اور فضا میں سے یہ چادر کچھ دیر کے لئے ہٹ گئی تو میں نے چھ مہینے کے بعد چاند کی شکل دیکھی مگر یہ چاند اتنا دور اور چھوٹا نظر آیا کہ مجھے بے اختیار ایشیا میں نکلنے والا چاند یاد آگیا جو اتنا بڑا اور قریب ہوتا ہے جیسے صحن کے کسی کونے میں سے نکلا ہو۔ مشرق کی چاندنی میں تو ہم نہایا کرتے تھے لیکن مغرب میں چاندنی تو کُجا خود

چاند کسی دوسری دنیا کا باسی نظر آتا ہے۔

سڑک پر چلتے چلتے میں روشنی کے ایک ستون کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ آدھی سے زیادہ رات گزر چکی تھی۔ سڑک پر اب ناچ گھروں اور شراب خانوں سے تھکے ٹوٹے نوجوان جوڑے گھروں کو واپس لوٹ رہے تھے۔ کبھی کبھار کوئی بے حد حسین لڑکی بڑی بے نیازی کے عالم میں سامنے سے گزر جاتی۔ رات کے وقت سڑک پر تنہا حسین لڑکی کو بڑے اطمینان اور سکون کے عالم میں اعتماد کے ساتھ چلتے ہوئے دیکھ کر وطنِ عزیز کی یاد آتی کہ جہاں دن کی روشنی میں بھی خواتین گھر سے باہر اکیلے قدم رکھتے ہوئے ڈرتی ہیں حالانکہ مذہب اور اخلاق کا چرچا وہاں بہت زیادہ ہے۔ کیا ہم اپنے معاشرے میں عورت کو اتنا بھی تحفظ نہیں دے سکے؟ لیکن نہیں مجھے ایسا نہیں سوچنا چاہیے۔ اہلِ مشرق اپنے آپ پر تنقید کو پسند نہیں کرتے اور ایسے خیالات رکھنے والے مغرب زدہ کہلاتے ہیں اور نفرت سے دیکھے جاتے ہیں۔ ہمیں مغرب کی اچھی چیز بھی اچھی نہیں لگتی۔ میں نے اپنی جیب سے سگرٹ کی ڈبیا نکالی اور اس میں سے آخری سگرٹ نکال کر خالی ڈبیا کو فٹ پاتھ پر پھینک دیا۔ اتنے میں کسی نے میرے کندھے پر آہستگی سے ہاتھ رکھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا، ایک بوڑھا جرمن زمین پر گری ہوئی میری خالی ڈبیا کو ہاتھ میں تھامے کھڑا تھا۔ اُس نے ڈبیا کو میرے سامنے ویسٹ پیپر باسکٹ میں پھینکتے ہوئے کہا۔

اے اجنبی! ہم اپنے گھر کو صاف ستھرا رکھتے ہیں اور چپکے سے چل دیا۔

مجھے یوں لگا جیسے اُس نے مجھے ایک زبردست تھپڑ دے مارا ہے۔ میں غیر ارادی طور پر اپنے گال سہلاتا ہوا وہاں سے چل دیا۔ اس بوڑھے نے یہ کیا کہہ دیا۔ ہم بھی تو پاکیزگی اور صفائی میں یقین رکھنے والی قوم ہیں مجھے یوں لگا جیسے اُس نے میری توہین کر دی ہو اور برسرِ عام میرے کپڑے اُتار دیئے ہوں۔

میری شخصیت کا ایک کنگرہ ٹوٹ کر نیچے گر گیا۔

دوسری صبح میں نے اپنا سامان ہوٹل میں سمیٹا اور کولون سے رخصت ہونے کے لئے ریلوے سٹیشن پر پہنچا۔ ایک ایک دو دو منٹ کے وقف کے بعد گاڑیاں آ اور جا رہی تھیں۔ میری والی گاڑی کے بارے میں لاؤڈ سپیکر پر اعلان ہوا کہ وہ ڈیڑھ منٹ لیٹ ہو گئی ہے۔ میرے پیچھے کھڑا ایک نوّے سالہ بوڑھا جس کا سر رعشے سے مسالے کے باوے کی طرح ہل رہا تھا، اپنے آپ سے کہہ رہا تھا "جرمنوں کا زوال پھر قریب آ گیا ہے۔ گاڑیاں ڈیڑھ منٹ لیٹ ہونے لگ گئی ہیں"۔ اس بوڑھے کا جملہ بھی یوں لگا جیسے کسی نے کندھوں سے پکڑ کے مجھے زور سے جھنجھوڑ دیا ہو حالانکہ ڈیڑھ منٹ کی تاخیر سے میرا کچھ نہیں بگڑ رہا تھا۔

میری شخصیت کا ایک اور کنگرہ چپکے سے نیچے ڈھے گیا۔

برلن پہنچتے ہی میں نے اپنی جرمن دوست فراؤ لائن "کے" کو فون کیا۔

"جرمنی میں یہ میری آخری شام ہے۔ صبح میں پاکستان واپس جا رہا ہوں کیا ہی اچھا ہو یہ شام اکٹھے گزار لیں"۔

"ضرور۔ ضرور۔ تم میرے گھر پہنچ جاؤ پھر وہاں سے شب بسری کا پروگرام بنائیں گے"۔

میں جلدی جلدی لباس تبدیل کر کے شام ڈھلنے کے ساتھ ہی "کے" کے فلیٹ کے باہر کھڑا تھا۔ گھنٹی دبائی۔ "کے" نے نہایت شیریں آواز میں اندر آنے کو کہا۔ وہ تقریباً تیار ہو چکی تھی اور اب فر کے اوور کوٹ کے بٹن بند کر رہی تھی۔ اُس کے قریب ہی کرسی پر اس کی ادھیڑ عمر کی ماں بیٹھی ہوئی تھی۔ ماں سے اُس نے میرا تعارف کرایا۔ تعارف سے اندازہ ہوا کہ وہ اپنی ماں سے میرا غائبانہ ذکر پہلے بھی کر چکی ہے۔

"یہ ہے وہ ایشیائی جو میری ایک ایک چیز کی تعریف کرتا ہے۔ کوئی بھی تعریف کرے تو تمہیں کبھی یقین نہیں آتا۔ اب یہ سامنے ہے پوچھ لو ناں اُس سے کہ میں اِسے کیسی لگتی ہوں۔" پھر مجھے مخاطب کرتے ہوئے اشارہ کیا کہ "تم خود ہی میری ماں کو بتلاؤ کہ تم مجھے کیا سمجھتے ہو؟"

میں نے انگریزی زبان میں 'کے' کی شان میں کچھ کہنا شروع کیا تو میں نے محسوس کیا کہ اُس کی ماں کے چہرے پر کوئی تأثر مرتب نہیں ہو رہا "کے" نے مجھے ٹوکا۔ "میری ماں انگریزی نہیں سمجھتی جرمن میں بات کرو۔"

"میری جرمن تو ایسی نہیں کہ کسی خوبصورت لڑکی کے بارے میں میرے احساسات کی ترجمانی کر سکے۔"

"کوئی بات نہیں۔ میں تمہاری مدد کروں گی۔ بولو، بولو۔ ماں بہت خوش ہو گی۔"

میں نے 'کے' کی تعریف ٹوٹی پھوٹی زبان میں شروع کی۔ جب میں نے 'کے' کے بارے میں اس کی ماں کو بتلایا کہ وہ "زیر حُبش" (بے حد حسین) ہے تو میں نے دیکھا کہ اس کی ماں کے چہرے پر یکلخت چمک آگئی ہے اور اُس نے میری جانب یوں دیکھا جیسے میں نے اس کی بیٹی کی نہیں بلکہ اس کے حسین ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ کہنے کو ابھی بہت کچھ تھا مگر میری جرمن آخری دموں پر آگئی۔

"کے" نے میری لڑکھڑاتی ہوئی زبان کو سہارا دیتے ہوئے کہا۔ "ماں کو ذرا یہ بھی بتلاؤ ناں کہ میرا جرمن، انگریزی اور فرانسیسی زبان کا لہجہ اور تلفظ کیسا ہے۔"

'کے' کو اپنی اس صلاحیت پر بجا طور پر ناز تھا کہ وہ تینوں زبانیں بڑی

صحت اور روانی سے بول سکتی ہے اور اس بارے میں اس کی جتنی بھی تعریف کی جاتی اُسے پھر بھی یہ احساس رہتا کہ ابھی صحیح تعریف نہیں ہوئی۔ اس کی ماں نے جب اپنی بیٹی کی صلاحیتوں کے بارے میں میرے اعترافات سُنے تو میں نے دیکھا جیسے اتنی ساری تعریفیں اپنی جھولی میں سمیٹنا اُس کے بس کی بات نہیں۔ وہ کچھ کچھ نروس سی ہونے لگی۔ "کے" نے موقع کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے کہا۔
"اچھا ماں! اب ہمیں اجازت دو۔ آج اس دوست کی برلن میں آخری شام ہے اور میں نہیں چاہتی کہ آخری شام میں یہ تنہائی کے احساس کے ساتھ یہاں سے واپس جائے۔ اچھا اب ہم چلتے ہیں۔ شب بخیر۔"
"شب بخیر" ماں نے جواب میں کہا "ہاں۔ اپنا خیال رکھنا اور بہت زیادہ دیر نہ کرنا۔"

ماں کے اس جملے پر "کے" نے ہلکا سا قہقہہ لگایا "میں جب بھی کسی دوست کے ساتھ ڈیٹنگ پر نکلتی ہوں ماں ہمیشہ یہی کہتی ہے۔ اپنا خیال رکھنا۔" پھر اُس کا لہجہ یکلخت بدل گیا "شاید میں اُس کی واحد اولاد ہوں ناں اس لئے پوؤر مدر۔ اس کی فکر ہی ختم نہیں ہوتی۔"

جب میں "کے" کے ساتھ فلیٹ میں سے باہر نکل رہا تھا تو میں نے ماں کی آنکھوں میں چمک اور بے بسی کی دو مختلف کیفیتیں دیکھیں۔ اُن جلتی بجھتی آنکھوں کو دیکھ کر مجھے یوں لگا جیسے کوئی بچہ بجلی کے بٹن کو تیزی میں اُوپر نیچے کرکے بلب کو جلا اور بجھا رہا ہو۔ روشنی، اندھیرا، اندھیرا روشنی اسی حالت میں ہم سیڑھیوں سے اُتر کر سڑک پر آگئے۔
"کہاں چلیں ابھی تو شب کا آغاز ہے۔ برلن ہلٹن کیسا رہے گا؟" "کے" بولی۔

"خیال تو اچھا ہے مگر ہماری کھال اُتر جائے گی وہاں"۔

"تم پیسوں کا سوچنے لگ گئے ہو — یہ آخری شب ہے، اسے خوبصورت یادوں کے ساتھ ہی اختتام کو پہنچنا چاہیے۔ ہم سب سے بالائی منزل کی چھت پر چلتے ہیں۔ وہاں کھلے آسمان کے نیچے کافی اور ڈانس کا لطف لیں گے۔ اس پر زیادہ خرچ بھی نہیں آئے گا"۔

"میں خرچ سے نہیں گھبراتا ڈکے! بات یہ ہے کہ واپسی کے سفر پر مجھے دو ایک ملکوں میں بھی ٹھہرنا ہے۔ سب کچھ یہیں ختم کر بیٹھا تو سڑک پر پڑا ہوا ملوں گا۔ مگر تمہیں ہلٹن پسند ہے تو پھر وہیں چلتے ہیں"۔

برلن ہلٹن کی کھلی چھت سے سارے برلن کی روشنیاں یوں ٹمٹما رہی تھیں۔ جیسے زمین پر ستارے اُگ آئے ہوں۔ چھت پر کھجوروں کے درخت دیکھ کر میں بہت دیر تک ورطۂ حیرت میں پڑا رہا۔ کھجوروں کے درختوں کے نیچے گہرے سرخ رنگ کے صوفوں پر ہم بیٹھ گئے۔ چھت کے درمیان میں الاؤ روشن تھا جس میں قریب بیٹھے ہوئے جوڑے تھوڑے وقفے کے بعد سوکھی لکڑیاں ڈال دیتے اور الاؤ کی لَو اور تیز ہو جاتی۔

کافی آگئی۔ ہم خاصی دیر سے آپس میں کوئی بات نہیں کر رہے تھے۔ اچانک ڈکے نے میرا نام لیا۔ "اُدھر سامنے والے صوفے پر اس عورت کو دیکھ رہے ہو؟ وہ سامنے جو وائن کا گلاس میز پر رکھے اُداس سی بیٹھی ہے"۔

میں نے سامنے دیکھا۔ پینتیس چالیس کے پیٹے میں ایک خاتون سُرخ وائن کا گلاس سامنے رکھے اُداس سی بیٹھی تھی۔ میں نے ڈکے سے پوچھا۔ "اس میں دیکھنے کی کوئی خاص بات ہے؟" اس نے کہا "ہاں خاص بات ہے"۔ میں نے پوچھا۔ "وہ کیا؟" تو ڈکے نے کہا۔ "یہ اُداس چہرہ اور تنہائی جو تمہیں نظر آ رہی ہے۔ یہ میرا مستقبل ہے"۔

"وہ کیسے؟ میں تمہاری بات سمجھا نہیں۔"

"ہاں تم یہ بات نہیں سمجھ سکتے۔ میں اس وقت ۲۵ برس کی ہو رہی ہوں۔ میری شادی بھی اگر دو ایک سال میں نہ ہوئی تو پھر میرا بھی یہی حال ہو گا جو تم سامنے والے صوفے پر دیکھ رہے ہو۔ مسلسل زہر آلود تنہائی اور ویرانی۔"

"ُکے! تم اپنے بارے میں بلا وجہ مایوس ہو رہی ہو۔ تم تو اس قدر حسین ہو کہ تم اگر ۲۵ برس تک پاکستان میں غیر شادی شدہ رہتیں تو اب تک تمہیں کوئی اغوا کر کے لے گیا ہوتا۔ تم اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہو؟"

"واقعی مجھے کوئی اغوا کر کے لے جاتا؟ بائی گوڈ۔ مجھے یقین نہیں آرہا۔ پاکستان کے نوجوان اتنے اچھے ہیں؟"

"تو کیا جرمنی کے مرد بُرے ہیں؟"

"جرمنی کے مردوں کی بات کیا کرتے ہو۔ جرمن عورت کا المیہ جرمن مرد ہے۔ انتہائی خود غرض۔ جب کام نکل جاتا ہے تو دوسرے لمحے ہی منہ پلٹ کے سو جاتا ہے۔" ُکے' کے لہجے میں سخت تندی آگئی تھی۔

ممکن ہے یہ جرمن مرد سے نفرت ُکے' کے ذاتی تجربے کا نتیجہ ہو جسے وہ جرمنی کے تمام مردوں پر چسپاں کر رہی تھی۔ بہرحال گڑبڑ کوئی نہ کوئی ضرور تھی اس لئے کہ ُکے' واقعی جرمن لڑکیوں میں بھی نمایاں طور پر حسین تھی۔ اس کا اندازہ مجھے اُس کے ساتھ سڑک پہ چلتے ہوئے کئی مرتبہ ہوا۔ وہ سرو قد کی بھرے ہوئے جسم کی لڑکی تھی۔ اُس کا قد اکثر جرمن مردوں سے بھی نکلتا ہوا تھا۔ سُنہری لمبے بال کندھوں پر گرتے ہوئے اُن میں اس کا گول چہرہ اور گہری نیلی آنکھیں اور ترشی ہوئی یونانی ناک بے حد متناسب تھے۔ اُس نے مجھے بتلایا تھا کہ اُس کا دادا جرمن اور دادی فرانسیسی تھی اور یوں وہ جرمنی اور فرانس کی بہترین کشید

ہے۔ سڑک پر جب میں اُس کے ساتھ نکلتا تو جرمن نوجوان مڑ مڑ کے اُسے دیکھتے اور دیکھنے ہی رہ جاتے۔ کبھی کبھی وہ مجھے داد بھری نظروں سے دیکھتے جو اس حسینہ کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اپنے ساتھ لئے جا رہا ہوتا۔ جب بھی کوئی نوجوان بہ نظرِ حسرت مجھے دیکھتا تو میں جھینپ سا جاتا اور قریباً نروس ہو جاتا۔ ہاتھ میں ہاتھ ڈال کے کسی حسینہ کے ساتھ سڑک پر چلنے کا یہ تجربہ میرے لئے ویسے بھی انوکھا تھا۔ شروع شروع میں جب میں ڈکے، کے ساتھ بازار میں گھومنے کو نکلتا تو ہاتھ لٹکائے اُس کے برابر چلنے لگتا۔ ڈکے، میرا ہاتھ اپنے نرم و گرم ہاتھ میں تھام لیتی اور غصے سے کہتی "تمہیں سڑک پر عورت کے ساتھ چلنے کے آداب معلوم نہیں؟ اِدھر لاؤ اپنا بازو۔ یوں۔ ہاں۔ مردوں کی طرح ایسے"۔۔۔ اور وہ میرے بازو کو اپنی کمر کے گرد گھما کر لپیٹ دیتی۔ میں بے حد آکورڈ محسوس کرنے لگتا۔ مجھے یوں لگتا کہ بس اگلے چوک پر میری بیوی کھڑی ہو گی اور وہ مجھے اس حالت میں دیکھ کر سرِ عام چلانا شروع کر دے گی۔ اس چوک سے ذرا آگے خاندان کا کوئی بزرگ تاک لگائے گھات میں بیٹھا ہو گا اور وہ سرِ بازار میرا تیا پانچہ کر دے گا اور اگر اپنوں میں سے کسی نے سڑک پر نہ دیکھا تو اللہ تعالیٰ ایک بے نکاحی غیر محرم کو ساتھ لپٹائے ہوئے دیکھ کر مجھے نہیں بخشے گا۔ ایک احساسِ جرم میرے بازو کے راستے سے ہوتا ہوا میرے قلب و ذہن میں سرائیت کر جاتا۔ جسمانی لذّت کا خوف میرے رگ و پے میں اُتر جاتا اور دہکتا ہوا دوزخ سامنے دکھائی دینے لگتا۔ میں فوراً اپنا بازو ڈکے، کی کمر سے جھٹک کر کھینچ لیتا۔ وہ پوچھتی "تمہیں کیا ہوا؟ ڈر کیوں گئے؟ کیا مجھ سے ڈر لگتا ہے؟ میں کوئی ڈرنے کی چیز نہیں"۔۔۔ میں اسے یہ کہہ کے معذرت کر لیتا کہ مجھے اس طرح چلنے کی عادت نہیں ہے، بس اور کوئی بات نہیں۔

برلن ہلٹن کی اس شب ڈکے، بہت اداس تھی۔ اتنا اداس میں نے اُسے

پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ ہرلن ملٹن کا آرکسٹرا بہت تیز پوپ دُھن بجا رہا تھا۔ جس پر کئی جوڑے صوفوں پر سے اُٹھ کر فرش کے عین درمیان ناچنے لگ گئے تھے۔ ٹِکے، ٹِکے ایک ہاتھ میں کافی کی پیالی تھی اور دوسرے ہاتھ کی انگلیاں صوفے کی سطح پر دُھن کی تال پر بے اختیار چل رہی تھیں۔ پھر اس کا پاؤں بھی تال دینے لگا۔ یکایک وہ بجلی کی مانند صوفے سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور میرا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"اُٹھو اِس دُھن پر ناچیں اور اس شب کو بے حال ہو کر تمام کریں"۔

"مگر میں تو ناچنے کے معاملے میں بالکل پھسڈی ہوں۔ خواہ مخواہ تماشہ بننے والی بات ہے"۔

"نو نو۔ کس کا تماشہ؟ جب ہم ناچیں گے تو لوگ تمہاری طرف نہیں، میری طرف دیکھ رہے ہوں گے۔ یقین نہیں آتا تو آزما کے دیکھ لو۔ یوں بھی جب کوئی لڑکی اپنے ساتھ ناچنے کی دعوت دے تو اس دعوت کو ٹھکرانا مردانہ پن کے منافی ہوتا ہے۔ اُٹھو۔ اٹھو!"

ٹِکے، کچھ اس شان سے میدان میں اُتری کہ اُس کے جسم کی پہلی تھرک کے ساتھ ہی ہوٹل میں جیسے زلزلہ آگیا۔ وہ کس قدر خوبصورتی اور والہانہ پن سے ناچتی تھی۔ اس کا اندازہ مجھے اُسی شب ہوا۔ اُس کے سامنے مجھے قدم اُٹھانا ہی بھول گئے تھے، تال کا ساتھ دینا تو دُور کی بات تھی۔ وہ گردن اور کولھوں کے جھٹکوں سے اپنے ساتھ شامل ہونے کی تحریک کرتی اور میں اس کے جواب میں نہایت بے ڈھبے انداز میں اُچھل کود کرتا اور پھر ساکت ہو جاتا مگر وہ میری اس بے تال سنگت کے باوجود بڑے جذبے اور زور میں ناچتی رہی۔ درمیان میں اس نے دھمال بھی ڈالی جس سے بے خودی کی کیفیت سب پہ طاری ہو گئی۔ جی چاہتا کہ اس کا ناچ یونہی جاری رہے اور اگر یہ رُک گیا تو اس کے ساتھ ہی کائنات کی نبضیں

بھی رک جائیں گی۔ جب اُس نے ناچ ختم کیا تو چاروں طرف سے تالیوں کی گونج اُٹھی۔ وہ پسینے سے تر ہو چکی تھی۔ واپس صوفے پر آن کر میں نے اُسے بتلایا کہ ناچنے میں تمہارا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔

"ضرور ہوتا ہوگا اس لئے کہ میں ناچنا جانتی ہوں۔"

سامنے اب دوبارہ ناچ شروع ہو چکا تھا۔ 'رکے' نے میری جانب دیکھا۔

"میرا خیال ہے اب کسی اور جگہ چلتے ہیں۔ یہاں اب اپنے آپ کو دہرانے والی بات ہوگی۔"

"میں بھی کچھ ایسا ہی محسوس کر رہا ہوں۔"

ہم برلن ہلٹن سے باہر نکلے تو ٹیر گارٹن کے تاریک راستوں پر ہو لیے۔ اس وقت رات اور گہری ہو چکی تھی۔ درختوں اور فٹ پاتھ پر سفید سفید برف کی دبیز تہیں جمی ہوئی تھیں۔ برف کی روئی کے گالے ہمارے اوورکوٹوں اور گرم ٹوپیوں پر گر رہے تھے۔ راستے چُپ تھے۔ البتہ گھنے درختوں کے نیچے کسی جوڑے کی سرسراہٹ ہوتی جو ایک دوسرے سے یوں چمٹے ہوتے جیسے دو نہیں، ایک ہی جسم ہیں۔ 'رکے' نے چلتے چلتے مجھے اپنے ساتھ چمٹا لیا اور اُس کے کوٹ کی فر میری گردن اور گالوں پر ہلکی ہلکی گدگدی کر رہی تھی۔

"آج نو دسمبر ہے۔ برلن میں یہ تمہاری آخری شب ہے۔ کل تم یہاں سے چلے جاؤ گے۔"

"ہاں۔ کل مجھے جانا ہی ہے۔"

"ابھی تو سحر نہیں ہوئی۔"

"تو ہم کب تلک ان تاریک راستوں پر چلتے رہیں گے؟ چلو روشنی کی طرف چلیں۔"

"روشنی میری زندگی میں نہیں ہے، مجھے اس سے نفرت ہے یا تو اندھیرا ہو یا پھر نیم روشن فضا کہ جس میں چہروں کے خدوخال روشنی اور تاریکی میں گھل مل جاتے ہیں۔"

"ٹیکسی! ٹیکسی!" رکے نے ہاتھ کے اشارے سے ایک تیز رفتار ٹیکسی کو رکنے کے لئے کہا۔

"صوفیہ شرلاٹن پلاٹز۔"

"یہ کون سی جگہ ہے؟"

"برلن کی ایک بستی جو نیم روشن اور نیم تاریک ہے۔"

ٹیکسی رکی اور تھوڑی دور پیدل چلنے کے بعد ہم ایک نیم روشن سے پَب کے باہر کھڑے ہو گئے۔

"یہیں بیٹھتے ہیں۔" رکے نے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

یہ ایک چھوٹا سا پَب تھا۔ بمشکل آٹھ دس آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ۔ کونوں اور دیواروں میں چھپی ہوئی روشنیوں کا عکس ہی کمرے میں پڑتا تھا اور بیٹھنے والوں کے چہرے واضح طور پر نظر نہیں آتے تھے۔ دو تین جوڑے سایوں کی صورت نظر آئے اور وہ بھی وِسپرز میں باتیں کر رہے تھے یا پھر ایک دوسرے کو چومنے میں محو تھے۔

رکے نے ایک خالی کونے کی طرف اشارہ کیا۔ ہم وہاں بیٹھ گئے۔

"مجھے بھوک لگ رہی ہے، میں تو کچھ کھانا پسند کروں گی۔ تمہارا کیا خیال ہے؟ تم کھانے میں شریک نہیں ہونا چاہتے تو کچھ پینے کے لئے منگوا لو۔"

"رکے! ایک بات پوچھوں؟"

"ہاں۔ کیوں نہیں؟"

"آج تم اس قدر اداس کیوں ہو؟"

"میری اداسی میں میرا حصّہ کم اور مقدر کا زیادہ ہے۔"

"مقدر تو وہی ہوتا ہے جو آدمی خود اپنے لئے بناتا ہے۔"

"جو آدمی خود اپنے لئے بناتا ہے وہ مقدر کا صرف ایک حصّہ ہے لیکن اتفاقات اور حادثات تو آدمی خود پلان نہیں کرتا۔"

"تم ماورائی حقیقتوں پر زیادہ ایمان رکھتی نظر آتی ہو۔"

"اس لئے کہ ماوراء بھی حقیقت ہے مگر ہم اپنی محدود عقل سے اُسے سمجھ نہیں پاتے۔"

"میں تو اب تم سے رخصت ہو رہا ہوں اور تم فلسفی بن بیٹھی ہو۔ خوبصورت لڑکیوں کی زبان سے فلسفہ اور ماورائی حقیقتوں کا تذکرہ بڑا عجیب سا لگتا ہے۔"

"نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ میں عملی زندگی میں بڑی جذباتی سی لڑکی ہوں، عشق کرتی ہوں تو میری روح اور جسم کا ایک ایک رواں اسی کیفیت میں ڈوب جاتا ہے۔"

"عشق تم کسے کہتی ہو؟"

"وہی کہ جو مکمل ہو۔ جس کو چاہتی ہوں اُس کو روح کی گہرائیوں کے ساتھ اور محبوب کی رُوح تک پہنچنے کے لئے جسم ایک خوبصورت وسیلہ ہے۔ ایسا عشق میری سمجھ سے بالاتر ہے جو صرف روحانی اور جذباتی ہو مگر اس میں جسموں کا لمس نہ ہو۔ اس لمس ہی سے تو رُوح کے تار جھنجھنا اُٹھتے ہیں۔"

"مگر ہم مشرقی لوگ تو رُوح کے زیادہ قائل ہیں، جسم ہمارے نزدیک ثانوی اور عارضی حیثیت رکھتا ہے!"

"تم مشرقی لوگ جسم سے خوف زدہ ہو۔ جسم جو خدا تعالیٰ نے تخلیق کیا کہ اس میں روحیں قیام کریں ——— یہ بے حد خوبصورت تخلیق ہے ——— اور پھر

یہ بھی کہ مخالف جسموں میں ایک دوسرے کے لئے کشش رکھی ہے۔ وہ ایک دوسرے کے قریب آنے کے لئے بیتاب رہتے ہیں۔ تڑپتے ہیں۔ اُن کی تشنگی اُسی وقت بجھتی ہے جب یہ مل جاتے ہیں اور جب یہ مل جاتے ہیں تو روحوں کو سکون ملتا ہے۔ کیا سمجھے ہو؟"

"کے"! مجھے پہلی مرتبہ کسی لڑکی سے مل کر یہ محسوس ہوا ہے کہ ایک دوسرے کو چاہنا نہایت فطری خواہش ہے، یہ کوئی جرم نہیں، گناہ نہیں، پتہ نہیں کیا بات ہے کہ ہم کسی کا بازو بھی پکڑتے ہیں تو گناہ کا احساس بھی ساتھ ہی پیدا ہو جاتا ہے۔"

"یہ صحت مندی کی نہیں بیماری کی علامت ہے۔"

'کے' کی باتیں سن کے مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میں عمر بھر بڑی معصوم اور فطری خواہشوں کے اظہار سے بھی محروم رہا اور میری روح میرے جوان جسم کے اندر اپنی تنہائی کے زہر میں گلتی سڑتی رہی اور آج 'کے' نے جیسے مجھے اپنی ہی قید سے رہائی دلوا دی ہو۔

"'کے'، میں آج تمہارے پاس سے اپنی آزادی حاصل کر کے جا رہا ہوں، لیکن میری ایک خواہش ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا اس کا اظہار کیوں کر کروں؟"

"خواہشوں کو دبانا نہیں چاہئیے اس لئے کہ وہ دبانے کے لئے ہوتی ہی نہیں۔"

"میں چاہتا ہوں کہ ہم جدا ہونے سے پہلے اس لمحے کو ابدی بنا ڈالیں۔ شاید یہ شب میری زندگی کی قیمتی یادوں کا حصہ بن جائے۔"

"ہم اس لمحے کو ابدی کیسے بنا سکتے ہیں؟"

"اسی طرح کہ رات کا باقی حصہ باتوں ہی میں نہ کھو ڈالیں۔ میرا مطلب ہے اپنی جدائی کے آخری لمحات کو کیوں نہ خوبصورت بنا ڈالیں کہ ان کے نقش ہماری روحوں پر ہمیشہ ثبت رہیں۔"

لُکے ئُ نے میرے جسم کے اندر مچلتی ہوئی خواہش کو بھانپ لیا۔ اُس کی آنکھیں بھر آئیں اور آنسو گہری نیلی آنکھوں سے بہہ نکلے۔

"تم رو رہی ہو! میری بات سے تمہیں دکھ پہنچا ہے؟"

"نہیں تمہاری خواہش کا میں احترام کرتی ہوں مگر میں اپنے مقدر پر رو رہی ہوں۔ یہ جگہ جہاں ہم بیٹھے ہیں یہاں اس سے پہلے میری تین محبتیں ٹوٹ چکی ہیں۔ یہ بڑی منحوس جگہ ہے مگر نہ جانے کیوں اپنے دوستوں کو اسی جگہ لاتی ہوں؟"

وہ باتیں کئے جا رہی تھی اور آنسو چھما چھم بہتے جا رہے تھے۔ پھر تھوڑی دیر خاموشی ہمارے درمیان رہی۔ اُس نے سگرٹ سُلگایا اور کہا "عجیب اتفاق ہے کہ جو مرد بھی مجھے پسند آئے وہ سبھی ایشین تھے، سبھی شادی شدہ تھے، بال بچوں والے تھے"

"مگر یہ بھی اتفاق ہے کہ ایشنز کے دل میں تم بھی گھر کر لیتی ہو"

وہ مسکرائی "ہاں کچھ ایسا ہی لگتا ہے مگر میں بہت تنہا ہوں۔ خیر اب تمہاری رخصت کی گھڑی قریب آ رہی ہے تو میں تمہاری اُس خواہش کو بھی پورا کر دینا چاہتی ہوں جس کے لئے تم نے مجھے کہا ہے مگر ایک بات ہے۔ اسے تحفہ ہی جاننا ـــــ ایک ایسی لڑکی کا تحفہ جو یہ تحفہ دینے کے بعد ہمیشہ کے لئے تنہا ہو جاتی ہے۔ تم اس لمحے کو جو ہماری گرفت میں ہے ابدی بنانا چاہتے ہو تو بنا لو مگر اس کے بعد ـــــ اس کے بعد میرے آنسوؤں کو کون دیکھ سکے گا"

مجھے یوں لگا کہ میں ایک انتہائی کمینہ انسان ہوں جو محض وقتی لذت کی خاطر ایک تنہا زندگی میں مزید تنہائی کا اضافہ کرنے کا سبب بن رہا ہے۔ مجھے اپنا آپ بہت ہی گھٹیا لگا۔ یوں لگا کہ میں سڑک پر ننگا ہو گیا ہوں۔ میں نے لُکے ئُ سے کہا "مجھے معاف کر دو! میری خواہش نے تمہارے دکھوں میں اضافہ کر دیا ہے، مگر یقین

جانو میں ایسا آدمی نہیں ہوں۔ ہم ایک دوسرے سے اسی طرح جدا ہوں گے جیسے ہم ملے تھے۔"

اس نے بڑی حیرانی سے میری طرف دیکھا۔"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ تم ناراض تو نہیں ہو گئے مجھ سے؟ ——— میں خواہش کو ٹھکرانے میں یقین نہیں رکھتی۔ مگر نہ جانے کیوں مجھے اپنے آپ پر کوئی اختیار نہیں رہا اور میں بچوں کی طرح تمہارے سامنے بلبلانے لگ گئی ہوں۔ مجھے معاف کر دو۔"

"نہیں رُکے، ایسی کوئی بات نہیں۔ ہم سب اپنی خواہشوں کے اسیر ہیں اور ان سے مکمل رہائی پانا ہم جیسے دنیاداروں کے لئے ممکن بھی نہیں۔"

ہم پب سے باہر نکل آئے تھے۔ برفانی ہوا نے ہمارے ہاتھوں کو چھوا۔ دُور سڑک کے آخری کنارے پر پو پھٹ رہی تھی اور آنے والی صبح کے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔

"اچھا۔ خدا حافظ رُکے! پتہ نہیں جیتے جی پھر کبھی ملیں گے یا نہیں۔"

"خدا حافظ۔ میرے اجنبی دوست۔" اُس نے اُداس لہجہ میں پکارا اور فٹ پاتھ کے سامنے دیوار کے ساتھ کھڑے ہو کر اپنے ہونٹوں کے یاقوت میرے ہونٹوں پر جڑ دیئے۔

برف کے گالے ہمارے چہروں پر گر رہے تھے مگر اس کے بھرپور ہونٹوں کی حرارت سے جسم کی ساری برف پگھل رہی تھی۔

"خدا حافظ۔ خدا حافظ"

"پاکستان سے اپنے لئے کون سا تحفہ پسند کرو گی؟"

"بس ایک مرد، جس کو میں اپنا کہہ سکوں۔"

آسمان پر سفیدی کی چادر آہستہ آہستہ پھیلنے لگی تھی۔ میں ٹیکسی میں بیٹھا اُس

کے دُھندلے شیشوں میں سے اُسے اپنے فلیٹ کی جانب تیزی سے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس نے اپنے آنسو چھپانے کی خاطر ایک مرتبہ بھی پلٹ کر نہ دیکھا۔ ٹھنڈی خنک صبح کی چھاؤں میں ہم یوں جدا ہو گئے، جیسے رات، صبح کی روشنی سے جدا ہوتی ہے۔ ۹ دسمبر کی صبح کو میری شخصیت کے بُت کا ایک اور کنگرہ زمین پر گر گیا۔

آج جب میں تین سال بعد ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل میں گُک سے ملنے کیلئے پہنچا تو وہ لاؤنج میں بیٹھا میرا منتظر تھا۔ میں نے بڑی گرم جوشی سے اُس کے ساتھ ہاتھ ملایا مگر اس نے مجھے یہ کہہ کر گلے لگا لیا کہ پاکستان میں گلے لگے بغیر ملاقات ادھوری رہتی ہے۔

یہ دسمبر کی آخری تاریخیں تھیں اور ہم مشرقی پاکستان میں جنگ ہار چکے تھے۔ بد دلی اور مایوسی کے گھٹا ٹوپ، اندھیرے ہمارے دلوں میں اُتر چکے تھے۔ بے یقینی کی اس فضا میں ہمیں اپنے آپ کی بھی خبر نہیں رہی تھی۔ تھوڑی دیر ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد گُک نے کہا "یہ اچھا ہوا کہ جنگ ختم ہو گئی"

"جنگ تو ختم ہو گئی ہے مگر گُک یوں لگتا ہے کہ ہم اس میں کہیں اپنے وجود کو کھو بیٹھے ہیں"

گُک نے اپنی عقابی نظروں سے میری طرف یوں دیکھا جیسے یہ بات وہ پہلے بھی کہیں سُن چکا ہے۔ "کس وجود کی بات کرتے ہو؟"

"اپنے پورے وجود کی۔ قومی، سیاسی اور تاریخی وجود ہماری اجتماعی شخصیت کے کئی کنگرے گر گئے ہیں"

"اجتماعی وجود؟ — اجتماعی وجود تو انفرادی وجود سے بنتا ہے، وہ قائم قائم ہے تو پھر کس بات کی فکر"

"لیکن ہر کک! تمہارے اجتماعی وجود میں اس جرمن بوڑھے کا وجود بھی تو شامل ہے جس نے سگرٹ کی ڈبیا زمین پر سے اُٹھا کے مجھے بتلایا تھا کہ وہ اپنے گھر کو صاف رکھتے ہیں۔ وہ نوّے سالہ رعشہ زدہ بوڑھا بھی اس وجود کا حصّہ ہے۔ جو ڈیڑھ منٹ گاڑی لیٹ ہونے پر خوفزدہ ہو گیا تھا اور ماتم کرنے لگا تھا اور فراؤلائن رُکے، بھی شامل ہے جو پیار کے رشتے میں کسی احساسِ جرم کا شکار نہیں۔"

ہُک میری باتیں سن کر مسکرایا۔ "مگر یہ کردار تو ہماری تہذیب کے نمائندے ہیں، یہ ہمارے گوئٹے، بیتھوون، شلر اور باخ ہیں۔ ہمارا وجود انہی سے عبارت ہے۔"

قوموں کے تہذیبی وجود پہ باتوں کا سلسلہ طول پکڑ گیا اور پھر تہذیبی وجود سیاسی وجود میں گھل گیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ کک شٹرئہ کی جنگ کے بعد ہمارے اسی سیاسی وجود کے بارے میں جاننا چاہتا ہے جو تین برس پہلے میں نے کولون شہر میں جرمنوں کے سلسلے میں اُس سے دریافت کیا تھا۔

میں نے اُس کا ارادہ بھانپ لیا تھا۔ اس کے تجسّس کا کوئی مدلّل جواب نہ اس وقت میرے پاس تھا اور نہ اِس وقت ہے۔ میں نے اسے فقط اتنا کہا کہ "میں تو ابھی اپنی شخصیت کے اُن ٹوٹے ہوئے کنگروں کو جوڑ رہا ہوں جو کچھ تو جرمنی میں گر گئے تھے اور کچھ اس جنگ کے ہاتھوں ٹوٹ گئے۔ میں پہلے اپنے آپ کو سمیٹ لوں تو پھر شاید تمہیں میرا وجود نظر آ سکے۔ فی الحال تم جب واپس جاؤ تو برلن میں اِس پتے پر فراؤلائن رُکے، سے اگر ملاقات ہو جائے تو اسے میرا یہ پیغام دے دینا کہ ہر سال ۹ دسمبر کو مجھے اُس کی فرمائش کا خیال آتا ہے جو میرے پاکستان آتے وقت اُس نے کی تھی۔ مگر مجھے بے حد افسوس ہے کہ فی الحال میں اُسے اس کا منہ مانگا تحفہ بھجوانے سے قاصر ہوں اس لئے کہ پیار کے معاملے میں ہم ابھی تک احساسِ جرم سے چھٹکارا نہیں پا سکے۔

زرد ماضی کی خوشبو

ایم۔اے کے امتحان سے فارغ ہو کر میں نے سوچا کہ واپس اپنے شہر چلا جاؤں جہاں سے نکلے ہوئے مجھے پانچ چھ برس ہونے کو آئے تھے۔امتحان کی فکر سے میری صحت بہت گر گئی تھی اور لگاتار محنت کی وجہ سے میرا اعصابی نظام بگڑ چکا تھا۔بازار میں چلتے چلتے یہ وہم ہونے لگتا کہ ابھی یہیں کہیں کسی دوکان کے سامنے گر جاؤں گا۔گھر سے اکیلا نکلنے کا حوصلہ نہ پڑتا تھا بس یہی محسوس ہوتا کہ اکیلے میں کہیں گر گیا تو مجھے کون سنبھالے گا اور کون گھر پہنچائے گا۔بھرے بازاروں میں میری حالت اور بھی بگڑ جاتی۔میں بازار کے عین وسط میں چلنے کی بجائے اطراف میں دوکانوں اور دیواروں کے ساتھ ہو کر چلتا کہ گروں گا تو دیوار کو تو تھام لوں گا۔پتہ نہیں یہ صرف اعصابی نظام کے کمزور ہونے کی بنا پر تھا یا پھر کوئی نفسیاتی مرض تھا جو مجھے لاحق ہو گیا تھا۔لیکن اتنا پتہ ہے کہ اس تکلیف کے ہاتھوں میں جسم کے علاوہ ذہنی طور پر بھی بہت دُبلا ہوتا جا رہا تھا اور اس قدر عاجز آ گیا تھا کہ کئی دفعہ میں نے خواہش کی کہ اس عذاب سے

جینے کی نسبت موت آجائے تو وہ میرے لئے کہیں آسان ہوگی ۔ فوری طور پر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اپنے شہر میں واپس جاؤں اور وہاں جا کر مکمل فراغت سے رہوں۔ بچپن کے دوستوں سے ملوں، اپنے پرانے سکول میں جاؤں، اپنی گلیوں اور بازاروں میں گھوموں اور بے فکری کے کچھ دن گذار کر کھوئی ہوئی صحت کو بحال کروں ۔ اس فیصلے سے مجھے ایک گونہ تقویت پہنچی اور مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں نے واپس اپنے شہر میں جانے کے فیصلے سے اپنے آپ کو محفوظ کر لیا ہے اور اب میں دیواروں کے سہارے ڈھونڈھنے کے بجائے اپنے پاؤں پر خود اعتمادی سے کھڑا ہو سکوں گا اور واقعہ یہ ہے کہ میں نے اپنی پنڈلیوں میں باقاعدہ ایک طاقت محسوس کی جو مجھے کھڑا ہونے اور چلنے بلکہ دوڑنے پر ابھار رہی تھی ۔

میں جب واپس اپنے شہر پہنچا تو میں نے محسوس کیا کہ آہستہ آہستہ میرے سارے جسم میں طاقت آرہی ہے اور اپنے بچپن کی فضا سے گھل مل کر میری رگوں میں خون پھر سے دوڑنے لگا ہے ۔ اتنے برسوں کے بعد میں نے ان دوستوں کی تلاش کی جو میرے ساتھ سکول میں پڑھا کرتے تھے مگر پھر غربت اور تنگدستی کے ہاتھوں درمیان ہی میں سلسلہ تعلیم چھوڑ گئے تھے اور ان کی شکلیں دیکھے مدت ہو گئی تھی ۔ ان میں اسلم تھا ۔ جس کو کلاس میں "اسلو" کہہ کے بلاتے تھے ۔ نصیرا تیلی تھا، فقیر محمد عرف پھیرو نائی تھا ۔ اس بیچارے نے تو کبھی کسی کی حجامت نہ کی تھی مگر اس کا باپ چونکہ حجامتوں کا کام کرتا تھا اس لئے فقیر محمد کو یہ خطاب ورثے میں قبول کرنا پڑا تھا ۔ واحدہ لکڑ پاڑ تھا جس کے باپ کا لکڑیوں کا ٹال تھا، پھیرو نائی کی طرح عبدالواحد عرف واحدے لکڑ پاڑ کو بھی یہ خطاب اپنے باپ کی اس خطا پر ملا ہوا تھا کہ وہ اپنے

بال بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے لکڑیاں پھاڑتا تھا اور بیچتا تھا۔ ایک دن شام کے وقت گھومتے گھماتے میں جی۔ ٹی روڈ پر سینما کی عمارت کے سامنے کھڑا تھا تو میں نے دیکھا کہ میرے سامنے تکے کبابوں کی ایک دکان پر خوب رونق ہے۔ مصالحوں میں گندھے ہوئے گوشت کو آگ پر رکھنے سے ایک ایسی خوشبو دھوئیں کے ساتھ چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی کہ بے اختیار میرے منہ میں پانی آگیا اور میں نے ارادہ کیا کہ اس دکان سے تکے کباب کھائے جائیں۔ میں دکان کے سامنے پہنچا تو کیا دیکھا کہ دھکتے ہوئے کوئلوں کی ایک بڑی سی انگیٹھی کے سامنے ایک لحیم شحیم پہلوان نما قسم کا آدمی بیٹھا ہوا ہے۔ اُس کی شیو تین چار دن کی بڑھی ہوئی تھی۔ مگر اُس کے گھنے بالوں کی سیاہی میں سے اُس شخص کی جلد کی روشنی جھلکیاں مار رہی تھی اور اس کا جگمگ جگمگ کرتا ہوا چوڑا ماتھا پسینے کی بوندوں سے چمک رہا تھا۔ اس کے مضبوط کندھوں پر نمایاں چیز اس کی موٹی گردن تھی جو بغیر کسی لچک کے چہرے اور کندھوں کے درمیان نصب ہوئی نظر آتی تھی۔ میں نے اُسے مخاطب ہو کے کہا مجھے ایک درجن تکے اور ایک درجن کباب تیار کر دو۔ وہ ایک دم چونکا۔ پھر اُس نے میری طرف یوں دیکھا کہ جیسے میری آواز کے راستے سے وہ میرے خدّوخال پہچان رہا ہے۔ وہ ذرا سا مسکرایا اور گرم سیخ کو پانی کی بالٹی میں ڈالتے ہوئے مجھے کہا:

"تم باؤ منیر تو نہیں ہو؟"

"میں نے کہا ہاں۔ میں منیر تو ہوں مگر باؤ سے میری میل ملاقات نہیں ہے۔"

اس نے کہا کہ جو پتلون پہنے اور پڑھ لکھ جائے وہ باؤ ہی بن جاتا ہے۔ مجھے پہچانا ہے کہ نہیں؟

میں نے جواب غور سے دیکھا تو وہ اُسلو تھا جو پانچویں جماعت میں سالانہ

امتحان سے پہلے ہی پڑھائی چھوڑ کر اپنے باپ کی دکان پر اس کے ساتھ کام میں لگ گیا تھا۔ باپ کا تھوڑا بہت کام تو وہ سکول سے چھٹی کے بعد بھی کیا کرتا تھا اور جب کلاس میں اُس سے پوچھتے کہ تمہارے ہاتھوں سے پیاز کی بُو کیوں آتی ہے تو وہ بتلایا کرتا کہ وہ ہر روز گھر جا کر کئی کئی سیر پیاز چھیلتا ہے جس سے صبح تک اس کی آنکھوں سے پانی بہتا رہتا ہے۔ مگر باپ کا کاروبار بڑھ گیا تھا اور اُسے اپنے ساتھ مدد کی ضرورت تھی۔ اُسلو پانچویں جماعت سے اُٹھا اور باپ کے ساتھ کباب لگانے لگ گیا۔ اس کا باپ اب بوڑھا ہو چکا تھا اور اب وہ انگیٹھی کے سامنے نہیں بیٹھتا تھا۔ وہ حج کرنے کے بعد جب واپس آیا تو اس کا بس یہی کام تھا کہ اپنی دکان کے باہر کرسی لگا کر بیٹھا رہتا اور صرف گاہکوں کا خیال رکھتا کہ انہیں سودا حاصل کرنے میں کوئی دِقت تو نہیں ہوتی۔

میں نے اسلم سے پوچھا کہ تم اسلو تو نہیں ہو؟

اُس نے خوش ہو کر کہا کہ آخر پہچان ہی لیا تم نے باؤ۔ پھر اُس نے بالٹی میں سے ایک بھیگی ہوئی سیخ نکالی اور تیار شدہ قیمے کا ایک چھوٹا سا گولہ بنا کر اُس میں چڑھایا اور اپنے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کو ملا کر گولے کو سیخ پر پھیلاتے ہوئے پوچھا "اتنے سالوں کے بعد ملے ہو! کتنی جماعتیں پڑھ گئے ہو؟" میں نے ایک لمحے کے لئے سوچا کہ اگر میں نے یہ کہا کہ ایم۔ اے کا امتحان دے کے آیا ہوں تو اس کی سمجھ میں کیا آئے گا۔ چنانچہ میں نے اسے کہا "سولہ جماعتیں پڑھ کے آیا ہوں۔"

"سولاں جماعتیں"۔ اس نے زیرِ لب دُھرایا پھر میری طرف نظر بھر کے یوں دیکھا جیسے میرا جائزہ لے رہا ہو اور کہا:

"کوئی سواد تے نہ آیا۔ ذرا اپنی جان ویکھ تے ساڈی ویکھ۔" (یعنی کوئی لطف نہ آیا اس لئے کہ ذرا اپنی جان کو دیکھو اور ہماری صحت بھی ملاحظہ کرو)

اُس کی اِس بے ساختگی پہ میں جھوم اُٹھا اور ایک لمحے کے لئے مجھے یہ محسوس ہوا کہ اگر پڑھائی لکھائی کے بعد یہی حالت ہو جاتی ہے جو اس وقت میری ہے تو اس سے کباب لگا لگا کر جان بنانا کہیں بہتر کام ہے۔ اُس نے مجھے بیٹھنے کو کہا اور کہا کہ تھوڑی دیر انتظار کرنا پڑے گا۔ آج میں اپنے یار کے لئے ایسی چانپیں لگاؤں گا کہ ساری عمر یاد کرتے رہو گے کہ اسلم کی دوکان پر گئے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب پلیٹیں میرے سامنے آئیں تو ان میں پڑی ہوئی گرما گرم چانپوں کی خوشبو اور اُن کی خستگی سے اُن کا وہ لُطف آیا کہ میں ہونٹ چاٹتا رہ گیا۔ اُٹھ کے جیب جانے لگا تو میں نے پوچھا۔ بھئی کتنے پیسے ہوئے؟ اِس پر اسلم نے یخنیں چھوڑ کر دھوتی کے پلّو سے اپنے چہرے پر سے پسینہ پونچھتے ہوئے صرف اتنا کہا:

"بڑے افسوس کی بات ہے۔ اتنے برسوں کے بعد ملے ہو اور پیسوں کا پوچھتے ہو۔ تمہارا کوئی قصور نہیں۔ یہ سولہ جماعتوں کا قصور ہے۔"

میں یہ جواب سن کر شرمندہ سا ہو گیا۔ میں نے اسے بڑا سمجھانے کی کوشش کی کہ میں نے کوئی ایسی بڑی بات نہیں کی اور اُسے اس کا اتنا بُرا بھی نہیں منانا چاہیے مگر اُس کی شکل سے معلوم ہو رہا تھا کہ میں نے کوئی ناقابلِ معافی جُرم کر دیا ہے۔

دو چار دن بعد ریلوے کراسنگ کے پاس نصیرے تیلی سے ملاقات ہو گئی۔ جو ریلوے پھاٹک کے ساتھ ریڑھی لگائے گنڈیریاں بیچ رہا تھا۔ گنڈیریوں پر پانی چھڑکتے ہوئے وہ "ٹھنڈے نے میٹھے پیڑے" کی ھانک لگا رہا تھا۔ دو چار تازہ موتیے کے ہار بھی اس نے گنڈیریوں پر پھیلا رکھے تھے۔ نصیرے تیلی کو پہچاننے میں دقت ذرا نہ ہوئی کہ اس کی شکل اتنے برسوں میں بھی ذرا نہ بدلی

تھی سوائے آواز کے جواب پیشہ ور ریڑھی لگانے والوں جیسی ہو گئی تھی۔ اُس نے ریڑھی چھوڑ کر مجھے زور سے اپنے گلے لگا لیا اور کافی دیر کے بعد الگ کر کے کہا کہ "ٹھنڈ پے گئی اے" ہم بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اس نے چُن چُن کے "مُڈھ والے حصّے" کی گنڈیریاں میرے آگے رکھیں اور اصرار کر کر کے کھلاتا رہا۔ جب میں چلنے لگا تو اس نے گنڈیریوں پر سے ایک ہار اُٹھا کر میرے گلے میں ڈال دیا اور کہا کہ یہ اپنے غریب دوست کا تحفہ سمجھو۔ میں نے دیکھا کہ نصیرے تیلی کی آنکھوں سے فخر اور خوشی کی جھلک روشنی کی لہر کی طرح باہر نکلی مگر پھر دیکھتے ہی دیکھتے بجھ گئی۔ جُدا ہوتے وقت اُس نے اتنا کہا کہ "تم نے میرے پاس آکر میرا سر اُونچا کر دیا ہے۔ میری زندگی میں ٹھنڈی میٹھی گنڈیریوں کے علاوہ اور کیا رہ گیا ہے"۔ میں نے اس کے موتیے کے ہار کو گلے سے اُتار کے ہاتھ کے گرد لپیٹ لیا اور گھر جا کر ایک کتاب کے صفحوں میں رکھ کر بند کر دیا۔

اسی طرح آہستہ آہستہ واحدے لکڑ پاڑ اور پھیرو نائی سے بھی ملاقاتیں ہو گئیں۔ واحدے لکڑ پاڑ نے کمیٹی میں داروغے کی نوکری کر لی تھی اور لمبی لمبی مونچھیں رکھ لی تھیں۔ پھیرو نائی حجامتیں کرنے کے بجائے جرّاحی کی دوکان کرتا تھا اور سیاسی گفتگو بڑے ذوق شوق اور اعتماد سے کرتا تھا۔ واحدے لکڑ پاڑ اور پھیرو جرّاح نے مجھے گھر بلا کر بڑی خاطریں کیں۔ آخری دن تک ہاتھ تھام تھام کے روکتے تھے کہ کچھ دن اور ٹھہر جاؤ۔ اپنے شہر کی بہاریں روز روز کہاں نصیب ہوتی ہیں۔ میرا جی بھی ایسا لگ گیا تھا کہ ان کو چھوڑنے کے خیال ہی سے مجھے یوں لگتا کہ میں پھر اکیلا ہو جاؤں گا اور کمزور۔

پتہ نہیں کیا بات ہے مگر ایمانداری سے کہتا ہوں کہ روز بروز ان بچپن کے دوستوں کے درمیان بیٹھ کر جن کو میں بھلا چکا تھا مجھے یوں لگا جیسے میری

کھوئی ہوئی طاقت آہستہ آہستہ پھر پلٹنے لگی ہے اور اسلم کشمیری، نصیر اتیلی، واحدؔ لکڑ پاڑ اور پھیرو نائی میرے دست و بازو ہیں، میری طاقت ہیں، میری توانائی ہیں اب میں بھرے بازار کے عین درمیان سینہ تن کے چلنے لگا تھا اور اس تلاش میں رہتا تھا کہ کوئی گرنے لگے تو اُسے اپنے ہاتھوں پہ تھام لوں۔ میں یہ بیان کرنے سے قاصر ہوں کہ مجھ میں یہ اتنی طاقت کہاں سے آگئی تھی اور یہ کہ اس سے پہلے میں اتنا کمزور کیوں ہو گیا تھا آج کوئی بیس برس بعد میں نے اپنی الماری میں سے پڑھنے کے لئے ایک کتاب نکالی۔ اُسے جب کھولا تو صفحوں کے درمیان نصیرے تیلی کے دیئے ہوئے موتیے کے ہار کے مُرجھائے ہوئے پھول ملے ہیں۔ مرجھائے ہوئے پھول دیکھ کر مجھ پر موت سی طاری ہونے لگتی ہے اور مجھے اپنا جسم قبر دکھائی دینے لگتا ہے۔ ان کی زرد خوشبو میرے اِردگرد پھیل گئی ہے اور میری آنکھوں میں آنسو تیر رہے ہیں۔ ایک مدت کے بعد میں پھر اپنے آپ کو بے حد کمزور محسوس کر رہا ہوں اتنا کمزور کہ شاید کوئی دیوار بھی مجھے سہارا نہ دے سکے۔

پھر موجِ ہوا پیچاں

پھر وہ بادل جو صبح دم سے ہاتھی کی شکل میں آسمان پر منجمد ہو کر ٹھہرا ہوا تھا، تیز ہوا کے چلتے ہی گھلنا شروع ہوا۔ پہلے اُس کی سُونڈ غائب ہوئی، پھر بڑے بڑے کان غائب ہوئے، پھر ایک ایک کر کے پاؤں روئی کے چھوٹے چھوٹے گالے بن گئے مگر اُس کا گرانڈیل پیٹ جو بہت پھیلا ہوا تھا، بڑی دیر تک نظر آتا رہا۔ مگر ہوا اب اِس قدر تیز ہو گئی تھی کہ وہ بھی آہستہ آہستہ بھُر بھُراتا یوں بکھرنے لگا جیسے سُوجی کا بسکٹ مُٹھی میں دبانے سے چھوٹے چھوٹے دانوں میں بدل جاتا ہے۔

وہ یہ منظر چارپائی پر لیٹے بڑی دیر تک دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے اپنی آنکھیں ملیں جو رات کی گہری نیند سے سُرخ ہو رہی تھیں اور جاننا چاہا کہ وہ کہاں ہے اور ابھی ابھی کیا خواب دیکھ رہا تھا۔ مگر یہ خواب تو نہیں تھا۔ اس کی آنکھ اندھیرے منہ ہی کھُل گئی تھی اور اُس نے صبح کی سپیدی میں آسمان پر ہاتھی کو دیکھا اور دیر تک دیکھتا رہا حتیٰ کہ تیز ہوا چلی اور اس کا وجود تحلیل ہونا شروع ہو گیا۔ تیز ہوا اس کے جسم اور گالوں سے چھوئی تو اس کا سویا ہوا جسم جاگنے لگا اور اُس نے سوچا کہ وہ خواب

میں ہے کہ ہوش میں ۔ یہ کتنا بڑا ہاتھی تھا جو ہوا کے سامنے نہیں ٹھہر سکا ۔ ہوا جب
اور تیز ہو گئی تو اُس نے دیکھا کہ وہ اپنے سامنے گردو غبار کا ایک طوفان لئے چلی آ
رہی ہے ۔ جس میں خس و خاشاک کے علاوہ بڑے بڑے مضبوط درخت بھی سائیں
سائیں کرتے ہوئے زمین پر گرنے لگے ۔ اُس نے اُٹھ کر کھڑکی کے پٹ بند کرنے
چاہے مگر طوفان اب اتنا تیز تھا کہ وہ جونہی کھڑکی کے پٹ آپس میں ملاتا ، وہ ہوا
کے تیز چلنے سے پھر پیچھے کو ہٹ جاتے اور اس کے ساتھ ہی گرد و غبار کا ہجوم
کمرے کے اندر آن گرتا ۔ اُسے گرد و غبار سے بڑی نفرت تھی ۔ اپنا کمرہ اس نے
بہت بنا سجا کے رکھا ہوا تھا اور اس کے اندر ایک اپنی الگ دنیا بسا رکھی تھی جس کا
باہر کسی دنیا سے کوئی تعلق نہیں تھا اور اب جو باہر کی دنیا ہوا کے ساتھ اُس کے
سجے ہوئے کمرے میں زبردستی اندر آنے لگی تو اس نے دیکھا کہ باہر کی دنیا میں خاصی
گرد ہے اور یہ گرد اندر کی دنیا کا حلیہ بگاڑنے کی خاصی سکت رکھتی ہے ۔ وہ گھبرایا ۔
کھڑکی کے پٹ کے ساتھ اب سارے گھر کے دروازے بھی بجنے لگے ۔ یوں سنائی دیتا
تھا کہ زمین پھٹ رہی ہے اور سارا آسمان روئی کے گالے بن کر اُڑ رہا ہے ۔ جیسے
زلزلہ سا آ رہا ہو ۔ ہوا کی سیٹیاں اب اتنی تیز ہو رہی تھیں کہ اُس نے کانوں
میں انگلیاں ڈال لیں مگر یہ آواز تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی ۔ اس نے انگلیاں
کانوں سے باہر نکال لیں ۔ باہر وہ شور اور ہنگامہ تھا کہ الاماں ۔ وہ گھبرا گیا ۔ کہیں
قیامت تو نہیں آنے لگی ۔ تیز ہوا کے بعد سیاہ بادلوں نے زمین کو پھر اندھیرے میں
لپیٹ دیا ۔ پھر ان میں گرج پیدا ہوئی ، تیز روشن بجلی چمکنے لگی ۔ بجلی کی چمک کے
ساتھ اُس کی آنکھیں چندھیانے لگیں ۔ اس چمک سے اس کے کمرے کی ساری چیزیں
ایک بار پھر روشن ہوتیں مگر اگلے ہی لمحے میں سب کچھ بجھ جاتا ۔ روشنی اندھیرا ،
روشنی اندھیرا ، ایک چکر چل گیا تھا ۔ اُسے پھر لگا کہ قیامت آ رہی ہے ۔ بادل کھل

کے برسا۔ وادی میں چاروں طرف جل تھل ہوگیا۔ بارش جب رُک گئی تو بادل کی چادر پھٹی اور پھر پہاڑوں سے ٹکراتی ہوئی ایک ندا اس کے کانوں میں آئی۔

"اے شخص! اُٹھ کہ تو کب تک سویا رہے گا۔ جس کو تو خواب سمجھتا ہے وہ حقیقت ہے۔ ہم پہلے خواب دکھاتے ہیں اور پھر اُن کا روپ حقیقت میں دیکھنا چاہتے ہیں"

اِس ندا کی گونج بڑھنے لگی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ پوری وادی میں یہ آواز گشت کر رہی ہے اور ہر شجر و بشر اس کی لپیٹ میں آگیا ہے۔ اُس نے کھڑکی کے پٹ کھول دیئے۔ وادی کے پہاڑوں کی تمام چوٹیاں بارش سے دُھل گئی تھیں اور چوٹیوں پہ پیڑ کی شاخوں پر سے روشنیوں کے موتی جھلملا رہے تھے۔ اس نے کھڑکی سے باہر سر نکال کے جاننا چاہا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ آواز اُس کے کمرے کے اندر سے ہی پیدا ہوئی ہو اور اس کے کان خواہ مخواہ بج رہے ہوں مگر جونہی اس نے یہ سوچا تو وہ ندا پوری وادی میں ایک دم پھر گونج گئی۔ وہ یک لخت چیخ اُٹھا۔

"تم کون ہو؟ اپنے آپ کو ظاہر کرو"

"میں تمہارا عہد ہوں اور یہ جو کچھ ابھی تم نے دیکھا ہے اس سے ڈرو مت کہ یہ تمہارے عہد کی تفسیر تھی"

"مگر بتلاؤ کہ میں کس عہد میں ہوں اور یہ کونسا وقت ہے کہ دن ہے نہ رات"

"وقت وہ ہے کہ دونوں وقت آپس میں مل رہے ہیں۔ نہ دن غروب ہوا ہے، نہ رات شروع ہوئی ہے اور عہد میں خود ہوں۔ میری طرف دیکھو اور مجھے پہچانو"

"میں تمہیں پہچان بھی لوں تو پھر کیا ہوگا؟"

"پھر تمہیں میری گواہی دینا ہوگی۔"

"یہ کیوں ضروری ہے؟"

"یہ اس لئے ضروری ہے کہ زندہ لوگ اپنے عہد کی گواہی دے کر ہی اپنے عہد کو زندہ کر جاتے ہیں۔"

"عہد کا زندہ رہنا کیا ضروری ہے؟"

"اس لئے کہ تم زندہ رہو۔"

"میں تو زندوں میں ہوں نہ مُردوں میں۔ جیسے اس وقت نہ دن ہے نہ رات، میں نہ زندہ ہوں نہ مردہ۔"

"تو پھر تم کس حالت میں ہو؟"

"پنجرے میں ہوں۔ گرفتار۔ پھڑ پھڑاتا ہوں مگر اُڑ نہیں سکتا۔"

"یہ کیا کہا تم نے؟ اُڑ نہیں سکتا! تمہارے پَر تو کسی نے نہیں کھینچے! ان دو پرندوں کو یاد کرو جو پنجرے کو ہی اُڑ کر لے گئے تھے۔"

"پھر کیا وہ آزاد ہو گئے؟"

"ہاں پنجرے کو انہوں نے آگ لگا دی۔"

"کتنے پرندے ہیں جو اس طرح آزاد ہو سکتے ہیں؟"

"تمام وہ پرندے جن کے پَر ہیں، جو آزاد فضاؤں میں اُڑنا چاہتے ہیں۔"

"کیا تمہاری یہ آواز میں ہی سن رہا ہوں یا ہر وہ پرندہ بھی سُن رہا ہے جو قفس میں ہے۔"

"میری آواز مکے اور مدینے۔ یہ جانداروں کے علاوہ پہاڑوں کو بھی سنائی دے رہی ہے۔"

"پہاڑوں کو آپ جاندار کیوں نہیں سمجھتے؟ وہ تو اپنی جگہ سے ہلتے رہتے ہیں اور حرکت تو زندگی ہے۔"

جب پتھر ہلنا چھوڑ دیں تو پہاڑ بن جاتے ہیں۔ پھر وہ سنتے تو ہیں مگر ہلتے نہیں۔"

"مگر میری سماعت تو بحمداللہ صحیح ہے۔"

"پھر تم وہ کیوں نہیں سُنتے جو سیاروں میں ہو رہا ہے۔"

"سیاروں کی آواز کون سن سکتا ہے؟"

"ہر اُس شخص نے سُنی جس نے اپنے عہد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے للکارا کہ اے عہد میری آنکھوں میں جھانکو، مجھے پہچانو۔ تم میرے اندر ہو۔ زندہ رہنا چاہتے ہو تو مجھ میں سما جاؤ کہ میں اپنا عہد ساتھ ہی لے کے آیا ہوں۔"

"یہ تو پیغمبروں کا کام ہے۔ وہ عہد کی گواہی بھی دیتے ہیں اور اپنے عہد کو تخلیق بھی کرتے ہیں۔"

"پیغمبر مثال اسی لئے بنتا ہے کہ اس کی صفات آگے چلیں۔ تم پیغمبر نہیں ہو مگر پیغمبرانہ شان تو تمہارا بھی خاصہ ہونی چاہیئے۔"

"اے میرے عہد میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے تمہاری آواز کو سُنا اور تمہیں پہچان لیا۔"

"گواہی دو کہ تم نے مجھے اس طرح پہچانا کہ میرے اندر جو ظالم تھا تم نے اُس کو للکارا۔"

"میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے اپنے عہد کے ظالم کو للکارا۔"

"یہ گواہی میں نے زبان سے بھی دی اور خون سے بھی کہ زمانے کے ماتھے پر یہ تحریر نقش ہو جائے اور آنے والی نسلیں دیکھیں کہ گواہی کا رشتہ اتنا زبان سے

نہیں جتنا خون سے ہے "۔

"میں خون سے گواہی کیسے دوں کہ میں اپنے تئیں اس وقت بے حد کمزور محسوس کر رہا ہوں "۔

"یہ کمزوری، احساس کی ہے۔ خون سے اس کا کوئی تعلق نہیں "۔

"میں کمزور ہوں۔ میں نے کئی مرتبہ اپنی حالت کو بدلنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارے مگر میں نے دیکھا کہ مجھ میں اتنی ہمت نہیں "۔

"مت کہہ کہ تو کمزور ہے۔ تو مضبوط تھا اور مضبوط ہے۔ کمزور تو اُس وقت ہوتا ہے۔ جب جبر کے آگے لیٹ جاتا ہے اور اُسے سہتا ہے "۔

"جبر میرا مقدر ہے، اِسے شاید مجھے سہنا ہی ہے "۔

جبر اُسی وقت تک مقدر ہے۔ جب تک تو اُس کے آگے سینہ تان کے کھڑا نہیں ہوتا "۔

"مجھے ہمت دو کہ میں جبر کے پنجے میں پنجہ ڈال سکوں "۔

"کیا تم اُن دو پرندوں کو بھول گئے ہو۔ جو قفس ہی کو لے کر اُڑ گئے تھے۔

"میرا پنجرہ بہت بھاری ہے "۔

"ہر پنجرہ بھاری ہی ہوتا ہے۔ پنجرہ بنانے والا دست و بازو دیکھ کے ہی پنجرہ بناتا ہے۔ عبرت ہے۔ عبرت ہے کہ آزاد ہونے والے یوں بھی جبر کا منہ توڑ کے دکھ دیتے ہیں۔ عبرت کہ میں ان پرندوں کو اپنے عہد کی گواہی دیتے ہوئے دیکھتا ہوں "۔ عبرت کہ جو عہد اپنے پیغمبروں میں جذب ہو کے اپنا اعلان کرتا تھا اب وہ عہد ان دو پرندوں کی پرواز میں اپنے زندہ ہونے کی شہادت دیتا ہے "۔

"مگر یہ بھاری وقت ہے۔ آئینے میں اپنی صورت دیکھتے ہیں تو سامنے ایک

خونخوار دشمن دکھائی دیتا ہے۔ جبڑے پھیلے ہوئے، آنکھیں باہر کو نکلی ہوئیں اور ہاتھ آگے کو بڑھتے ہوئے جیسے گردن دبا دینے کی کوشش میں ہوں۔"

"یہ دشمن تمہارے اندر ہے۔ آئینہ ہمیشہ فریب نہیں دیتا۔"

"یہ دشمن پہلے تو باہر تھا اب اندر کیوں کر آگیا؟"

"دشمن کو تم نے خود پالا پوسا ہے۔ بڑا کیا ہے۔ یہ باہر تھا اور جب تک باہر تھا تم اس کو پہچان سکتے تھے۔ اب تو یہ خون میں زہر کی مانند اُتر گیا ہے۔"

"رُوحوں کو بلواؤ۔ چرخی گھماؤ۔ میں ان سے پوچھوں کہ میرے خون میں یہ کون اُتر گیا ہے۔"

"رُوحیں اب نہیں آتیں۔ وہ آکر کریں گی بھی کیا۔ یہ زمانہ اب اُن کی زبان نہیں سمجھتا اور پھر یہ بھی ہے کہ زمانہ پچھلی رُوحوں سے راہنمائی حاصل کرنے کا قائل نہیں۔ یہ اپنی روح اپنی انقلابی قوتوں سے خود پیدا کرتا ہے جو عہد کی روح ہوتی ہے۔"

"باطن کے زہر کو کیونکر صاف کروں؟"

"باطن کا زہر منافقت ہے۔ دشمن کو دیکھ کے تمہیں آداب یاد آجاتے ہیں۔ مذہب کے نام پر تم اب بھی فریب دے سکتے ہو۔ کمینے کہیں کے۔"

"مت گالی بکو کہ اب میری شکل پر پہلے ہی نحوست برس چکی ہے۔ میں لعنتوں اور بد دعاؤں کے جنگل میں ہوں۔ بدروحوں میں گھرا ہوا۔ منافقت پہلے باہر تھی۔ اب اندر اُتر چکی ہے۔ ایمان بن چکی ہے۔ میں خدا کو بھی بیچتا ہوں، رسول کی قیمت بھی لگا دیتا ہوں۔ میں حقیر ہوں مگر میری زہرناکی ہی اب میری طاقت بنتی جا رہی ہے۔"

پھر یوں ہوا کہ وہ ندا جو اس کے کانوں میں گونجی تھی ذرا دیر کے لئے خاموش ہوئی تو اُسے یوں لگا کہ وہ صدیوں کی چُپ میں بے بس پڑا آسمان کو گھور رہا ہے اس کے کانوں کے پردے پھر بجنے لگے۔ یوں لگا جیسے باہر لوگوں کا شور ہو۔ اس شور سے پتہ نہیں کیوں اسے اپنے اندر طاقت کا احساس ہوا۔ پھر اس نے اپنے آپ کو گالی دی کہ وہ مدت سے اس شور سے کٹا رہا ہے۔ اس نے کہا کہ میں اپنے بھائیوں سے الگ ہوا اور بدروحوں نے مجھے گھیر لیا۔ یہ میرے بھائی بند ہیں۔ ہم سب بھائی ہیں۔ ابھی یہ لفظ اس کی زبان پر تھے کہ وہ ندائیں گونجی جیسے ہوا میں کسی نے کوڑا مارا ہو۔ اس نے دہشت سے آنکھیں میچ لیں۔

ہوا کی سنسناہٹ کہہ رہی تھی۔

"پھر سنا اُن لوگوں کو آدم کے دونوں بیٹوں ہابیل اور قابیل کا سچا قصہ جب دونوں نے نیاز چڑھائی پھر ایک یعنی ہابیل کی نیاز قبول ہوئی اور قابیل حسد سے جل گیا۔ کہنے لگا میں تو ضرور تیری جان لوں گا! ہابیل نے کہا: کیوں میرا کیا قصور ہے؟ اگر تو مجھے مار ڈالنے کے لئے اپنا ہاتھ مجھ پر چلائے گا تو میں تیرے مارنے کے لئے اپنا ہاتھ تجھ پر نہیں چلاؤں گا۔ میں تو اللہ سے ڈرتا ہوں میں تو یہ چاہتا ہوں کہ تو میرا اور اپنا دونوں کا گناہ سمیٹ لے اور دوزخیوں میں شریک ہو جائے کہ ظالموں کی یہی سزا ہے۔ آخر قابیل کے نفس نے اسے یہی سمجھایا کہ اپنے بھائی کو مار ڈالے۔ پھر قابیل نے ہابیل کو مار ڈالا اور خسارے والوں میں شریک ہو گیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ایک کوّا بھیجا جو زمین کو کریدتا تھا اور دوسرے مُردے کوّے کو اس میں چھپاتا تھا۔ اس کو یہ بتانے کو کہ اپنے بھائی کی لاش کو کیوں کر چھپائے۔ پھر قابیل پکارا۔ ہائے خرابی! میں اس کوّے سے گیا گزرا ہوں کہ مجھ سے اتنا نہ ہو سکا کہ اس کوّے کی طرح ہوتا اور اپنے بھائی کی لاش چھپا

دیتا۔ پھر لگا پچھتانے۔"

اس نے بھائی کے پچھتاوے کا قصہ سنا اور غمزدہ ہوا اور لگا غور کرنے کہ اس قصّے میں ہم سب کے لئے کتنی عبرت ہے اور جوں جوں وہ اس قصّے پر غور کرتا اُسے اپنے آپ پر ندامت ہوتی کہ بھائی بھائی کے درمیان جب نفس آجاتا ہے تو وہ کتنا بدل جاتا ہے۔ پھر اُس نے ظالم بھائی کے پچھتاوے کو یاد کیا اور پکارا کہ اے آواز مجھے طاقت دے کہ میں وہ نہ کروں جو قابیل نے ہابیل سے کیا۔
وادی پھر گونج سے پھٹنے لگی۔

"گواہی دو کہ تمہارے پروبال میں ابھی طاقت ہے! گواہی دو اپنے زندہ ہونے کی! گواہی دو کہ ظالم کو تم نے خاک میں ملا دیا! گواہی دو کہ لفظ کو تم نے خون سے تحریر کیا! گواہی دو کہ تمہارے عہد نے تم کو تمہاری ذات میں پہچانا کہ میں اس میں ہوں اور یہ مجھ میں ہے۔ میں زندہ ہوں اور میرے ساتھ یہ بھی زندہ رہے گا۔"

وہ تیز ہوا پھر چلنے لگی تھی کہ جس کے آگے ہاتھی بھی پگھل گیا تھا۔ اب وہ پُورا جاگ چکا تھا۔

ایک تھوکا گیا آدمی

وہ جب ایک مدت کے بعد وطن واپس لوٹا اور گاڑی سے اُتر کر ویگن میں سوار ہوا تو اُس نے ٹکٹ چیکر سے اسلام آباد کا ٹکٹ کاٹنے کو کہا۔ ٹکٹ چیکر نے ٹکٹ دینے سے پہلے اُونچی آواز میں اُس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "ڈیڑھ روپیہ"۔

ٹکٹ چیکر کی یہ حرکت اُسے ذرا عجیب سی لگی۔ کئی برس پہلے جب اُس نے وطن چھوڑا تھا اُس وقت ٹکٹ چیکر سواری کی صورت دیکھ کر ہاتھ میں ٹکٹ تھما دیا کرتے تھے۔ مگر اب ٹکٹ دینے سے پہلے پیسوں کا اعلان ذرا عجیب سی بات تھی۔ اُسے یوں لگا جیسے ٹکٹ چیکر نے اس کی قیمت ڈیڑھ روپیہ بھی نہیں لگائی گو بظاہر ولائتی سوٹ بوٹ میں ملبوس، وہ ڈیڑھ سو روپے سے بھی زیادہ حیثیت کا مالک دکھائی دے رہا تھا۔

پھر جب اُس نے دو روپے ٹکٹ چیکر کے ہاتھ میں تھمائے تو ٹکٹ چیکر نے بڑی بے اعتنائی سے ٹکٹ کاٹ کر اُس کے ہاتھ میں دیا اور لمبے کُرتے کی دائیں جانب کمر والی جیب کے اندر سے اٹھنی نکال کر اُس کے ہاتھ پہ رکھی

اور زور سے ایک تھوک ویگن کے فرش پر پھینکی۔ اٹھنی اور تھوک ایک ہی وقت میں ہاتھ پر اور فرش پر گرے۔

فرش پر گری ہوئی یہ تھوک اُسے اٹھنی لگ رہی تھی جو کسی سواری کی جیب سے وہاں گر گئی ہو اور کسی کی نظر نہ پڑی ہو۔ ایک لمحے کے لئے اسے یوں محسوس ہوا کہ کنڈکٹر نے اٹھنی فرش پر پھینک دی ہے اور تھوک اس کے ہاتھ پر گرا دی ہے۔ اُسے تھوک سے سخت نفرت تھی اور جب تک اسلام آباد کا اڈہ نہ آیا وہ تھوک اُس کے سامنے اُس کی نظروں سے چپکی رہی۔ اُسے یوں لگ رہا تھا کہ یہ تھوک اس کے سامنے پڑی اُسے واپس وطن آنے پر خوش آمدید کہہ رہی ہے۔ اُس نے جھنجھلا کر باہر کھڑکی میں دیکھنے کی کوشش کی مگر وہ تھوک اُس کے ذہن پہ اِس طرح چپک گئی کہ اُسے باہر پھیلی ہوئی زمین ویگن کا فرش دکھائی دینے لگی —— جس پر وہ تھوک اٹھنی کی صورت میں جگہ جگہ بکھری پڑی تھی

یہ پہلی تھوک تھی جو وطن میں قدم رکھتے ہی اُس کے سامنے گری تھی۔ اُس نے اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اکثر ٹکٹ چیکر بدتمیز اور جاہل ہوتے ہیں اور یہ تھوک اُس نے عادتاً پھینک دی ہے اور اس میں اچنبے کی کوئی بات نہیں۔ لیکن جب تک اسلام آباد کا اڈہ نہ آیا اور وہ بس سے نہ اُترا وہ تھوک اُسے بہت پریشان کرتی رہی اور جب اس نے ویگن سے باہر قدم رکھا تو اُسے ایسے لگا جیسے بس میں کسی نے اسے گالی دی تھی اور اب وہ دوبارہ ایک پاکیزہ فضا میں آ گیا ہے۔

دو چار روز گزر گئے۔ اُس نے جس جگہ آن کے قیام کیا تھا وہاں کا جغرافیہ معلوم کرنے کے لئے اُس نے شام کو سیر کا ارادہ کیا۔ وہ کپڑے پہن کر اپنے آپ کو اُس بستی سے متعارف کرانے کے لئے نکلا جس میں اب اُسے رہنا تھا اور بستی

کی عمارتوں اور راستوں کا جاننا ایسے ہی تھا جیسے وہ اپنے اِرد گرد کی فضا کو اپنے وجود سے آشنا کرنا چاہتا ہے۔ یہ عمارتیں اور راستے اب نہ جانے کتنی دیر کے لئے اس کے جیون ساتھی بننے والے تھے۔

وہ اپنی گلی کا موڑ مڑا۔ اُس کے دائیں جانب سُرمئی پہاڑ تھے اور نرم سی ہوا چل رہی تھی۔ سُرمئی پہاڑوں کی ڈھلوان پر سے سبز اور تر و تازہ خوشبو اُس کے نتھنوں کو چھونے لگی اور اُسے ایک خوبصورت لینڈ سکیپ میں اپنے آپ کو پانے پر ایک انجانی سی خوشی ہوئی۔ یہ بستی کس قدر خوبصورت ہے اور پھر یہ کہ اپنے وطن کا حصّہ ہے۔

وہ ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ سامنے سے لمبی داڑھی والا ایک مُلّا اور اُس کا ایک شاگرد جس کی داڑھی ابھی نئی نئی پھوٹی تھی، باتیں کرتے ہوئے آ رہے تھے۔ باتوں سے زیادہ ایسے لگ رہا تھا کہ وہ مُلّا اپنے شاگرد کو کوئی سبق دُھرا رہا ہے جو اُس نے اُسے مدرسے میں دیا تھا۔ جب وہ دونوں اس کے ذرا قریب آئے تو لمبی داڑھی والے مُلّا نے زور سے کھانسا اور گلے میں سے کرخت آواز کے ساتھ ایک بہت بڑی بلغمی تھوک اُس کی طرف دیکھتے ہوئے سڑک پر پھینکی۔ وہ ایک دم کانپ سا گیا۔ اُسے یوں لگا کہ مولوی صاحب نے جیسے اسے دیکھتے ہی ایک پتھر مار دیا ہے اور یہ پتھر سڑک کے اُوپر نہیں گرا اس کے جسم پر لگا ہے۔ تھوک سے اُسے سخت نفرت تھی مگر ابھی جبکہ وہ وطن کے تازہ خوشبودار جھونکے کے نشے میں سرشار ہونے کی کیفیت میں تھا، مولوی صاحب کی اُس تھوک نے اُسے جھنجھلا کے رکھ دیا۔ وہ تو اپنی بستی سے اپنا تعارف کروانے کو نکلا تھا مگر اس سے پہلے کہ وہ عمارتوں اور راستوں کو پہچان پاتا اس تھوک نے اُس کے وجود ہی کی نفی کر دی۔ اُسے ایک منٹ کے لئے ایسے لگا جیسے اُس

راستے کی عمارتوں میں سے تھوکیں گر گر کر اُس کے اُوپر پڑنے لگی ہیں اور وہ ایک ناپسندیدہ آدمی ہے۔ مگر جلد ہی اُس نے اس خیال کو دبا دیا کہ یہ محض ذہن کی اختراع ہے اور اسے اس طرح نہیں سوچنا چاہیئے۔ مولوی صاحب کو ایسے ہی بلغم سی آئی ہو گی اور انہوں نے اپنے سینے کو ہلکا کرنے کے لئے تھوک دیا۔ اِسے خواہ مخواہ زیادہ اہمیت نہیں دینا چاہیئے۔ مگر یہ دوسری تھوک تھی جو وطن واپس لوٹنے کے بعد اس کے حصے میں آئی تھی۔ اِس سے پہلے جب وہ یہاں تھا تو لوگ اُس وقت بھی بسوں، گاڑیوں اور سڑکوں پر تھُوکتے ہوں گے مگر اس نے کبھی اس کا نوٹس نہ لیا تھا اس کے باوجود کہ اسے تھُوکنا بہت بُرا لگتا تھا۔ مگر اب نہ جانے کیوں خود سے اُس نے تھُوکوں کی گنتی شروع کر دی تھی۔ اس دوسری تھوک پر اسے پہلے والی تھوک بھی یاد آ گئی جو ویگن کے فرش پر اٹھنی کی صورت میں گری تھی۔

اب اُس نے اپنے کام پر جانا شروع کر دیا تھا۔ وہ اپنے ساتھ سامان میں ایک کار بھی ساتھ لایا تھا جو اُسی روز کسٹم والوں سے آزاد ہو کر اسے ملی تھی۔ اُس نے اس کی سروس کروائی، نہلایا دُھلایا اور خوب چمکا کر اسے باہر نکالا اور دفتر کو روانہ ہوا۔ یہ بھی بڑی خوش نصیبی اور خدا کی نعمت ہے کہ آپ کے پاس اپنی سواری ہو اور وہ آپ کو بداخلاق ٹیکسی ڈرائیوروں رکشاوالوں اور بس کنڈکٹروں سے نجات دلائے رکھے۔ وہ دل ہی دل میں کلمۂ شکر ادا کرنے لگا کہ اتنے میں ایک ٹرک ہارن دیتا ہوا بڑی تیزی میں اس کے برابر سے نکلا اور جب اُس نے ٹرک کو راستہ دینے کے لئے اپنی کار کو ایک طرف کیا تو ڈرائیور کی کھڑکی میں سے ایک تھُوک اُڑتی ہوئی اُس کی کار کے سامنے والے شیشے پر ٹھک سے آن گری اور اُس کے چھینٹے دائرے کی شکل میں تھوک کے گرد کرنوں کی طرح پھیل

گئے۔ وہ سیٹ میں بیٹھا ایک دم اپنے سر کو پیچھے لے گیا۔ جیسے یہ تھوک اس کے منہ پر گر گئی ہو۔ اگر درمیان میں کار کا شیشہ نہ ہوتا اور وہ کار کی بجائے سڑک پر پیدل چل رہا ہوتا تو یہ اُڑتی ہوئی تھوک ضرور اس کے چہرے پر آن کے گرتی۔ اس نے جلدی سے کار کے وائیپرز چلا دیئے مگر اب وہ تھوک صاف ہونے کی بجائے پورے شیشے پہ پھیل گئی اور وہ شیشہ اندھا ہو گیا اور سامنے کا راستہ بھی اس کی نظروں کے سامنے گدلا سا گیا۔ اُس کا جی چاہا کہ وہ گاڑی وہیں کھڑی کر کے پیدل چلنے لگے کہ وہ شیشہ اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے سفید تھوک کی ایک چادر رہے جو اُس کے اور باہر کی فضا کی درمیان کھینچ گئی ہے اور اگر اُس نے ہاتھ سے اُس چادر کو درمیان سے ہٹانا چاہا تو اُس کے ہاتھ بھی تھوک سے لتھڑ جائیں گے ۔ اس کیفیت میں اُس کا جی متلانے لگا۔ وہ ٹرک اب بہت دور جا چکا تھا اور اسے فوراً یاد آیا کہ یہ تیسری تھوک ہے جو ایک ہفتے کے اندر اُس پہ گری ہے۔ اُسے اِس گنتی پہ حیرت ہوئی کہ کیوں وہ تھوکوں کو گن رہا ہے۔ حالانکہ پھینکنے والے عمداً کسی پر تھوک نہیں رہے ہوتے۔ وہ عادتاً ایسا کرتے ہیں یا کسی اور وجہ سے مگر اُن کی نیت یہ ہرگز نہیں ہوتی کہ وہ دوسروں پر تھوک رہے ہیں۔ تھوک اُن کی زندگی کا ایسے ہی حصّہ ہے جیسے جنسی فعل۔ جب تک معاشرے میں تھوکنے پر کوئی پابندی نہیں ہر ایک کو تھوکنے کی پوری پوری آزادی ہے۔ چار دیواری کے اندر بھی اور باہر بھی۔

اگلے روز وہ مارکیٹ کی طرف شاپنگ کو جا رہا تھا تو ایک چُپ چاپ سی سڑک پر گہرے سانولے رنگ کی ایک جوان سی لڑکی چلی آ رہی تھی۔ جس کے کپڑے تو مَیلے مَیلے سے تھے مگر جسم اور چہرہ دونوں پُرکشش تھے۔ اُس کی چال میں بلا کی جنسی کشش تھی جو راہ گیروں کو اپنی جانب متوجہ

کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔ جب وہ لڑکی اُس کے قریب پہنچی تو اُس نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں جھاڑو ہے۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ جمادارنی ہے اور جوانی کے نشے میں مست و بے خبر ہے۔ جونہی اُس کی نظریں اُس لڑکی سے چار ہوئیں تو اُس نے اُسی بے پرواہی کے عالم میں جس میں کہ وہ چل رہی تھی، تھوک دیا جیسے وہ اپنی طرف ہونے والی توجہ کی تصدیق کر رہی ہو۔ اپنے حسین ہونے کی تصدیق کا یہ انداز اُس کی سمجھ میں نہ آیا۔ ایک جوان و خوب رو دوشیزہ اپنی طرف متوجہ ہونے والے کو اپنے وجود کا احساس تھوک پھینک کر دلائے، یہ بڑی عجیب سی بات تھی مگر یہ واقعہ اپنی جگہ تھا کہ ایک جوان عورت کے یہاں جوانی کا احساس اس صورت میں ظاہر ہوا تھا۔ اِس پر اُس کی سوچ کا چکر پھر سے چلنے لگا کہ کیا یہ تھوک اس عورت کے وجود کی شہادت تھی یا اس نے اپنی جانب دیکھنے والے کو حقارت سے ٹھکرا دیا تھا اور جوانی کے نشے میں اُس کی نفی کر دی تھی؟ وہ کچھ نہ سمجھ سکا۔ تھوک اگر نفی اور حقارت کا اظہار ہے تو اس میں کونسی ایسی بات تھی کہ اُسے تھوک دیا جاتا۔ اُس نے تو اپنے تئیں ایک مرد ہونے کے ناطے نظروں ہی نظروں میں اُس کے حسن کی داد دینا چاہی تھی مگر جواب میں اُسے ایک تھوک زمین پر گری ملی۔ جو کچھ بھی تھا مگر یہ چوتھی تھوک تھی جو اُس نے گنی اور پہلی تین تھوکیں بھی اُسے یاد آگئیں اور پہلی مرتبہ اُسے اپنے وجود کے بارے میں شک ہونے لگا کہ کہیں اُس کے اندر کوئی ایسی تبدیلی تو نہیں ہو گئی جو لوگوں کو بے اختیار اُسے دیکھتے ہی، تھوک دینے پر مجبور کر دیتی ہے۔ وہ عجیب مخمصے میں پھنس گیا۔ کیا لوگ اب زیادہ تھوکنے لگے ہیں یا محض اُسے ایسے لگ رہا ہے؟ بہر حال کچھ نہ کچھ تبدیلی کہیں ضرور آ گئی تھی کہ جس شخص سے اُسے کسی طرح کا واسطہ پڑتا تو وہ شخص اُسے دیکھتے ہی تھوک دیتا۔ کہنے کو تو ابھی اُس نے چار تھوکیں ہی

دیکھی تھیں مگر اب اُسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ یہ تھوک اب اس کا مقدر ہے اور وہ جس شخص کی طرف دیکھے گا۔ تو وہ ضرور تھوک دے گا۔ یہ وہم تھا یا کیا تھا ــــ مگر واقعہ یہ ہے کہ اس کے بعد سڑک پہ چلتے ہوئے وہ اپنے آگے آگے چلنے والے کے بارے میں سوچتا کہ جونہی وہ اس کے برابر آئے گا تو وہ ضرور تھوک دے گا۔ وہ کسی اجنبی کے بارے میں ابھی یہ سوچ ہی رہا ہوتا کہ یہ میرے قریب آرہا ہے تو اجنبی کی تھوک گر جاتی اور اُسے لگتا کہ یہ تھوک اُسی کے لئے تھی۔ اب اتنی تھوکیں اُس کے سامنے گر چکی تھیں کہ اُن کی گنتی بھی گڈمڈ ہو گئی ـ وہ سینکڑوں تھیں کہ ہزاروں ایسا لگتا تھا کہ اُس کے چاروں طرف تھوکیں ہی تھوکیں ہیں اور وہ ان سے بچ نہیں سکتا۔

ایک مرتبہ اُسے اسلام آباد سے لاہور جانا پڑا۔ گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کی ایک بس پہ وہ سوار ہوا اور ڈرائیور کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس سیٹ پر تین سواریاں بیٹھ سکتی تھیں۔ وہ کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا تاکہ تازہ ہوا کے ساتھ باہر کے منظر سے لطف اندوز ہو سکے۔ جونہی بس سٹارٹ ہوئی تو اس کے بائیں جانب بیٹھے ہوئے ایک آدمی، جس نے گلے میں منکے ڈالے ہوئے تھے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے وہیں سے کھڑکی کی طرف زور سے تھوکا اور بلند آواز سے سفر کے حفاظت سے گزر جانے کی دُعا مانگی ـ اس تھوک کے چھینٹے اُڑ کر اُس کے چہرے پر گرے اور اُس کا جی ایک دم بیزار ہو گیا۔ اُس کے دل میں آیا کہ وہ اس فقیر صورت سائیں کو داڑھی سے پکڑ کے ایک زور کا چانٹا منہ پہ لگائے مگر وہ یہ سوچ کر چپ ہو گیا کہ ممکن ہے سائیں نے اللہ کو پکارنے سے پہلے اپنے منہ کو آلائشوں سے پاک صاف کرنا چاہا ہو۔ اللہ کا پاک نام لینے سے پہلے گلا اور منہ غلاظتوں سے پاک ہونے چاہئیں اور سائیں کی مراد یہی ہو گی۔ مگر اس تھوک کے کچھ چھینٹے اس کے چہرے پر بھی تو آن گرے تھے۔ کیا یہ اُسی نفی کے چھینٹے تو نہیں تھے جو اب یہاں اُس کا مقدر بن گئی تھی۔

اُسے لگا کہ اس نفی میں کچھ کچھ حقارت بھی شامل ہے۔ تھوکنے کے فعل میں یہ دونوں عناصر ہوتے ہیں۔

بس ابھی شہر سے نکلی ہی تھی کہ کھُلے منظر اُس کی نظروں کے سامنے آ گئے۔ اُس نے سائیں کی تھوک کو بھول جانا چاہا اور اپنی نظروں کے سامنے پہاڑی نالوں اور سرسبز وادیوں کے حُسن میں کھو گیا۔ ابھی وہ اس کیفیت کا لُطف لے ہی رہا تھا کہ اُسی سیٹ پر بیٹھا ہوا تیسرا آدمی جو ایک وردی میں ملبوس تھا، اپنی جگہ سے ذرا سا اُٹھا اور وہیں سے ایک زوردار تھوک کھڑکی کی طرف لنڈھا دی۔ اُس کے چھینٹے کچھ سائیں کے اور کچھ اس کے چہرے پر گرے۔ سائیں نے چھینٹے صاف کرنے کیلئے اپنے چہرے پر دایاں ہاتھ اس طرح پھیرا جیسے دُعا کے بعد پھیرا جاتا ہے اور سیدھا تکنے لگ گیا۔

مگر اس دوسری تھوک نے اُس کے سفر کا لطف کِرکرا کر دیا۔ اُس نے رومال نکال کر اپنے چہرے کو صاف کیا اور وردی والے کی طرف ایک سخت حقارت کی نظر ڈالی مگر وہ بڑی بے نیازی کے عالم میں اپنی مونچھوں کی مروڑ رہا تھا جیسے اُس نے کچھ کیا ہے نہیں۔ بالکل بے خبر۔ اُس کا جی چاہا کہ ایک مرتبہ وہ اُس کا گریبان پکڑ کر اُسے بتلائے کہ ہم سفری کے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں اور سیٹ پر بیٹھنے والے سبھی ایک جیسے ہوتے ہیں اور انہیں ایک دوسرے کا احترام ملحوظ رکھنا چاہیے۔ مگر اُس کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ اسے کچھ کہہ سکے۔ وردی والے کے چہرے پر جو اعتماد تھا اُس سے ایسا لگ رہا تھا کہ اُس سے اگر اس کا ذکر کیا گیا تو وہ کہیں یہ نہ کہہ دے کہ شکر کرو کہ میں نے تمہارے منہ پر نہیں تھوک دیا، باہر ہی تھوکا ہے اور تھوکنا نہ گناہ ہے، نہ ظلم۔ اس میں غصہ کرنے اور تلملانے کی کون سی بات ہے؟

لاہور تک سارا راستہ داڑھی والا اور وردی والا دونوں وقفے وقفے کے بعد برابر تھوکتے رہے اور وہ سارا راستہ رومال سے اپنا چہرہ صاف کرتا رہا مگر اب وہ بات کہ جو پہلے محض ایک خدشہ تھی اب یقین میں بدل گئی کہ وہ جہاں کہیں بھی ہوگا، تھوک سے نہیں بچ سکے گا۔ جب سے وہ واپس لوٹا تھا وہ سفر میں تھا یا حضر میں، اُس کے آگے پیچھے، دائیں بائیں تھوکیں ہی تھوکیں تھیں۔ جب وہ گھر میں بستر میں اکیلا لیٹا ہوتا تو اُسے تھو تھو کی آوازیں آنے لگتیں جو پہلے آہستہ ہوتیں پھر تیز ہونے لگتیں اور وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھتا اور تولیے سے اپنا چہرہ صاف کرنا شروع کر دیتا۔ چہرہ صاف کرنے کے بعد وہ غسل خانے میں جا کر آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتا تو اُسے لگتا کہ وہ پاگل ہوتا جا رہا ہے۔ مگر نہیں وہ تھوکیں جو باہر سڑکوں پر بسوں اور گاڑیوں میں، دفتروں اور گھروں سے اس کے اُوپر گر رہی تھیں ان سے اس کا چہرہ ہی نہیں، اب روح بھی مسخ ہونے لگی تھی۔

"تم وہ آدمی ہو جسے رد کر دیا گیا ہے۔"

"تمہارا وجود کسی کو قبول نہیں۔"

"تم ایک ناپسندیدہ شخص ہو۔"

"تم ایک ذلیل انسان ہو۔"

"گھٹیا ہو۔"

"حقیر ہو۔"

یہ سب تھوکیں تھیں جن کو کبھی وہ رومال سے صاف کرتا، کبھی تولیے سے اور کبھی بازوؤں سے۔ اُسے یقین ہو گیا کہ وہ فرقۂ ملامتیہ کا آدمی ہے اور چاروں طرف سے تھوکوں کی بارش ایک لعنت کی شکل میں اُس پر آن گری

گری ہے۔ مگر لوگ اُسے دیکھ کر اور اپنے درمیان پا کر کیوں تھوکنے لگ گئے تھے؟ وہ تو پہلے بھی تھوکتے تھے۔ بغیر کسی وجہ اور ضرورت کے تھوکتے تھے۔ کبھی کسی وجہ اور ضرورت سے بھی۔ گلا صاف کرنے کے لیے، بلغم خارج کرنے کے لیے اپنے وجود کا احساس دلانے کے لیے، کسی کی تذلیل کرنے کے لئے، نفرت کے اظہار کے لئے مگر ایسا کیوں ہونے لگا کہ ادھر اُس کی کسی سے مڈھ بھیڑ ہوئی اور اُس نے سوچا کہ یہ آدمی کہیں تھوک نہ دے کہ اتنی دیر میں اس نے تھوک دیا۔

اُس نے اپنے آپ سے گفتگو کرتے ہوئے کہا "تم نہ کسی کو زبان سے کچھ کہتے ہو نہ اشارے سے مگر پھر بھی تھوک دیئے جاتے ہو۔ اِدھر بس ذرا سوچ ہی رہے ہوتے ہو تو کھٹ سے ایک تھوک تمہارے سامنے آن گرتی ہے۔ تو کہیں یہ تھوک تمہاری سوچ پر تو نہیں گرتی؟

"مگر سوچ پہ تو کسی کا کوئی اختیار نہیں، بولنے اور اشارہ کرنے پہ تو ہو سکتا ہے۔"

وہ اپنی سوچ کے ہاتھوں عاجز ہونے لگا۔ اُسے ان لوگوں پر رشک آنے لگا جو سوچ سے عاری کر دیئے گئے ہیں کہ یہ ان کے خالق کا اُن پہ بڑا کرم ہے۔ وہ تھوکے تو نہیں جاتے، رَد تو نہیں کئے جاتے۔

"میں اپنی سوچ کے سَوتے کیسے بند کر دوں؟ اس کا کوئی طریقہ کوئی راستہ مجھے نظر نہیں آ رہا ہے۔ میں سخت حالتِ عذاب میں ہوں۔ میری سوچ میری مقبولیت کے راستے میں دیوار بن گئی ہے۔ نہیں دیوار نہیں، دیوار تو گرائی بھی جا سکتی ہے، یہ تو میرے لئے لعنت کا ایک طوق بن گئی ہے جو گردن میں پھنس گیا ہے۔ میں رَد کر دیا گیا ہوں، میں اپنوں میں ناپسندیدہ ہو گیا ہوں، میں اس لعنت سے بھاگ کے کہاں جاؤں؟"

"یہ لوگ کیوں تھوک رہے ہیں؟ یہ تھوکنے کے بجائے منہ سے کیوں کچھ نہیں کہتے؟ ایسے لگتا ہے کہ لفظ ان کے منہ کے اندر چُپ ہو گئے ہیں اور جب لفظ منہ میں چپ ہو جائیں تو پھر منہ کے اندر صرف لعاب ہی رہ جاتا ہے۔ اب انہیں جو کچھ کہنا ہے وہ تھوک کے کہہ دیتے ہیں۔ پس جو تھوک رہا ہے۔ وہ کچھ کہہ رہا ہے، اپنے زندہ ہونے کا احساس دلا رہا ہے۔" مگر جب لفظ تھوک میں بدلنے لگ جائیں تو یہ قربِ قیامت کی نشانی ہے۔

اُسے کوئی راستہ، کوئی روشنی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ اب کہیں بھاگ کے نہیں جا سکتا تھا۔ لعنت کے خوفناک سحر نے اُسے جکڑ لیا تھا۔ اس نے گھبراہٹ اور شدید نروس پن کے عالم میں اس لعنت پر تھوک دینا چاہا، پر جب اُس نے تھوکنے کی کوشش کی تو اُسے پتہ چلا کہ اس کا گلا خوف سے خشک ہو چکا ہے اور منہ میں لعاب نہیں رہا۔ اُس نے تھُو تھُو کی آواز نکالی مگر کوئی تھوک اُس کے منہ سے نہ نکلی۔

نہ جانے کیوں، یہ خوف کی وجہ سے ایسا ہوا تھا یا اسے تھوک سے شدید نفرت تھی۔ جو کچھ بھی تھا وہ کوشش کے باوجود نہ تھوک سکا اور خالی تھُو تھُو کی آواز نکال کے بالآخر چُپ ہو گیا اور بستر پہ گر گیا۔ نیند میں اُسے ایسا محسوس ہوتا رہا کہ اُس پر مسلسل تھوکوں کی بارش ہو رہی ہے اور جب وہ بیدار ہوا تو اُس نے دیکھا کہ اس کا سارا بدن تھوکوں سے لتھڑا پڑا ہے۔ وہ جلدی سے غسل خانے کی طرف بھاگا۔ پہلے وہ صرف چہرہ ہی صاف کیا کرتا تھا، اب پورا بدن صاف کرنے لگ گیا۔

وہ جو تنہا تھے

شفیق سے جب میں پہلی مرتبہ ملا تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ نہ صرف انگریزی زبان پہ اچھا خاصا عبور رکھتا ہے بلکہ گفتگو بھی خوبصورت کرتا ہے وہ اپنے سامعین کو اپنے حسنِ بیان سے مسحور کر لیتا ہے اور ہر بات عقل اور دلیل کی روشنی میں کرتا ہے۔ یہ پاکستان کے آغاز کا زمانہ تھا اور اس وقت ایسے شخص کو اپنے درمیان دیکھ کر بے اختیار یہ جی چاہتا تھا کہ یہ شخص اپنے علمی تبحر گہرے تجربے اور خوبصورت زبان کو ملک کی خدمت کے لئے کیوں نہیں وقف کرتا۔ اس سے بہتر پاکستان کی سفارت کون کر سکتا ہے۔ اسے باہر چلا جانا چاہیئے اور پاکستان کو دنیا میں روشناس کرانے کا فریضہ ادا کرنا چاہیئے۔ ذہنی اعتبار سے شفیق خاصا لبرل دکھائی دیتا اور اس کی شخصیت میں کوئی ایسی کمی دکھائی نہیں دیتی تھی جو اُس کے لئے دوسرے ممالک میں پرابلم بن جائے۔

ایک روز شفیق جب اپنے بیان کا جادو سامعین پر چلا رہا تھا تو میں نے اس کی تقریر کی داد دیتے ہوئے شفیق سے اپنی اس خواہش کا اظہار کر دیا۔ میں نے کہا شفیق تم میں جو خوبیاں اور کمالات ہیں تمہیں ملک سے باہر چلے

جانا چاہیے۔ ہمارے ساتھ مصیبت یہ ہے کہ باہر ہم ٹھیک طرح سے سمجھے ہی نہیں جاتے۔ کوئی ہمیں کچھ سمجھتا ہے کوئی کچھ تمہارے جیسا دردِ دل رکھنے والا پاکستانی جب ان لوگوں سے بات کرے گا تو ان لوگوں کو ہماری پہچان میں آسانی ہو جائے گی۔ پاکستان کی اس سے بڑھ کر اور کوئی خدمت نہیں ہو سکتی جو تم ادا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہو۔

شفیق نے میری جانب دیکھا اور کہا کہ تم ٹھیک کہتے ہو۔ میرا جی بھی بہت چاہتا ہے کہ باہر جا کے اپنے وطن کے لئے کچھ کام کروں مگر .....

اتنا کہہ کر وہ رک گیا۔

مجھے اس پر سخت حیرت ہوئی کہ ایسا چرب زبان اور رواں دواں گفتگو کرنے والا شخص یک لخت چپ کیوں ہو گیا ہے۔ یہ نہایت خلافِ معمول بات تھی کہ اس کا جملہ درمیان میں ٹوٹ جائے۔

میں نے کہا" ہاں ہاں کہو۔ مگر مگر کیا کرنے لگے ہو!"

اس نے کہا بات یہ ہے کہ میں انگلستان یا امریکہ یا کینیڈا کہیں چلا تو جاؤں مگر اب میری بیٹی جوان ہو رہی ہے۔ اگلے چار پانچ سالوں میں وہ ایک مکمّل لڑکی بن جائے گی، اور تم جانتے ہو وہاں اس معاشرے میں رہتے ہوئے اگر وہاں کوئی ٹام اس کا دوست بن گیا اور کسی روز نیچے سڑک پر سے سیٹی بجا کر میری نظروں کے سامنے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر لے گیا تو تمہارے اس شفیق کی سب سحر بیانی دھری کی دھری رہ جائے گی اس کی ساری محفل اور دلیلیں اپنا منہ پیٹتی رہ جائیں گی اور وہ وہیں خاک میں مل جائے گا۔

مجھے یہ سن کر ایک دھچکا سا لگا۔ شفیق بڑے لبرل اور آزاد خیال آدمی کا

امپریشن دیتا تھا اور کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ جب اس کی ذات کا معاملہ آئے گا تو اس کی سوچ کا دھارا بالکل ہی اُلٹ جائے گا اور وہ ایک مشرقی باپ بن کر اپنی بیٹی کے بارے میں اسی ردِ عمل کا مظاہرہ کرے گا جو یہاں رہنے والا ہر وہ باپ کرتا ہے جو مشرقی معاشرے کی قدروں کے سائے میں پلا بڑھا ہے اور اس کی اخلاقیات کے پیمانے اُس کے اپنے معاشرے کے اصولوں کے مطابق ہی ڈھلے ہیں۔ اُس کے لئے یہ منظر برداشت سے باہر تھا کہ کوئی نوجوان اس کی بیٹی سے دوستی کا دم بھرے اور اسے اپنے باپ کی موجودگی میں یوں گھر سے نکال کے لے جائے جیسے وہ اس کی میراث ہو۔

شفیق میری جانب دیکھ رہا تھا اور اس کی نظروں میں ایک سوال تھا جو وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا مگر میں خاموش ہو گیا تھا۔

اس مسئلے پر شفیق سے کوئی بحث کرنا بیکار بات تھی اور نہ میں اس میں اُلجھنا چاہتا تھا۔ وہ انسان جو ایک مخصوص معاشرے میں آنکھ کھولتا ہے اور اُسی میں پلتا بڑھتا ہے۔ اُس کی سوچ اس کی فکر اور اس کی شخصیت اس کے معاشرتی نظام اور قدروں کی نمائندہ ہوتی اور اس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ "آناً فاناً" اپنے عقیدوں اور اپنے فلسفے کو اٹھا کر ایک طرف رکھ دے ناممکن ہے، یہ انسانی فطرت ہی کے خلاف ہے۔ شفیق کی جوان بیٹی، شفیق کی خواہشوں اور ارادوں کے درمیان کھڑی ہو گئی تھی۔ شفیق نے اپنی بیٹی کو چُن لیا اور یورپ و امریکہ جانے کا فیصلہ مسترد کر دیا۔ اُس کے پاس اور کوئی چوائس نہیں تھی۔ بیٹی کو چن کر اُس نے مشرق کی حیا اور مشرق کے باپ کو محفوظ کر لیا۔

وہ یورپ اور امریکہ نہ جا سکا مگر اسے اپنے نہ جا سکنے کا افسوس بھی نہ تھا وہ اپنے فیصلے پر نہایت مطمئن اور شاد تھا اُسے لگتا تھا کہ اس نے اپنی بیٹی کو

ٹام سے بچا لیا ہے، مشرق کو مغرب کی یلغار سے بچا لیا ہے۔ ایک غریب الوطن باپ کی بے بسی کو بچا لیا ہے۔

شفیق کی بیٹی کی شادی ہوئے مدت ہو چکی ہے۔ شفیق کے بال چاندی ہوگئے ہیں مگر وہ اپنے نواسے نواسیوں کے درمیان کھیلتا ہوا یوں لگتا ہے کہ وہ پھر سے جوان ہو گیا ہے، بڑھاپے کی تنہائی اس کے قریب نہیں پھٹک پائی۔ شفیق بہت خوش ہے۔ اس کی خوشیوں میں ایک مشرقی باپ کے غرور و تمکنت کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔

پھر جب میں جرمنی میں تھا تو میری ملاقات صدیقی سے ہوئی۔ جس ملک میں انگریزی بولنے والا دُور دُور نہ ملے وہاں اُردو زبان ہی نہیں اُردو ادب سے دلچسپی رکھنے والا کوئی شخص مل جائے جو بات بات میں اساتذہ کے شعر ٹانکے اور جس کے منہ سے پھول جھڑتے ہوں تو کمال ہی ہو جاتا ہے۔ صدیقی کو وہاں پا کر میں بہت خوش ہوا کہ اپنی مٹی کی خوشبو اس کی باتوں میں تھی اور اپنی شاعری کا آہنگ اس کے لب و لہجے میں تھا۔ صدیقی وہاں کوئی بیس برس سے رہ رہا تھا۔ ڈاکٹریٹ کرنے آیا تھا۔ ڈاکٹریٹ تو اُس نے کر لی مگر پھر اسے پتہ چلا کہ وہ تو اب واپس نہیں جا سکتا۔ صدیقی اسی یونیورسٹی میں ایک جرمن لڑکی کے عشق میں گرفتار ہو چکا تھا جو اتنے برس صدیقی کی تنہائیوں میں اس کا ساتھ دیتی رہی۔ بے وطنی کے عالم میں کوئی ذرا سی ہمدردی بھی کرے تو وہ اپنا لگتا ہے۔ صدیقی جب تن تنہا زندگی کا مقابلہ کرتے کرتے تھکاوٹ محسوس کرنے لگتا اور اس کی ہمت متزلزل ہونے لگتی تو ڈورتھی اُس کا ہاتھ تھام لیتی اور اس کی تھکاوٹوں کو جذب کر لیتی جیسے شاک ابزورر صدموں کو پی جاتے ہیں۔ وہ اُسے تازہ دم کر دیتی، اُسے نئے حوصلے بخشتی اور سکون کی دولت سے مالا مال کر دیتی۔ صدیقی نے ڈورتھی سے اپنا ناطہ مستقل بنا دیا۔ اب

وہ اس کی بیوی تھی اور اب بیوی کو چھوڑ کے واپس جانا ممکن نہ تھا عورت دھرتی کا سمبل ہوتی ہے اور زمین سے رشتہ عورت سے رشتے کے بغیر جڑ نہیں پکڑ سکتا۔ صدیقی کی جڑ اب جرمنی میں لگ گئی تھی اور اب پھیلنے لگی تھی۔ اُس کے دو بیٹیاں ہوگئیں اور صدیقی کا گھر اب وہیں پہ بن گیا۔

جب میں صدیقی سے ملا تو دونوں بیٹیاں جوان ہو چکی تھیں۔ نہایت خوبرو اور ذہین۔ وہ صرف جرمن زبان بولتی تھیں، اُن کی ماں جرمن تھی اور وہ جرمنی ہی میں رہ رہی تھیں۔ گھر کے اندر اُردو تو کیا انگریزی کو بھی داخلہ نہ مل سکا تھا۔ صدیقی اور اُس کی زبان دونوں اس کے اپنے گھر میں اجنبی ہو گئے تھے۔ وہ اُردو زبان کا رسیا اور سخن شناس اور شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والا، اپنی بیٹیوں سے بھی اپنی زبان میں گفتگو نہ کر سکتا تھا۔ بیوی اور بیٹیوں کے درمیان ذریعۂ گفتگو ایک ایسی زبان تھی جو اس کے لئے تو مستعار تھی مگر بیوی بچوں کو ورثے میں ملی تھی۔ صدیقی اب اپنے آپ سے کٹ چکا تھا، اپنے آپ سے دور ہو چکا تھا۔ اسے اپنے آپ کو پہچاننے میں دِقّت ہونے لگی تھی وہ اپنی بیٹیوں سے جس زبان میں پیار کرنا چاہتا تھا، وہ زبان بیٹیاں نہیں سمجھتی تھیں وہ اپنے پیار کو اپنے سینے میں لئے بیٹھا تھا اور اسے دیکھ کے یوں لگتا تھا کہ جیسے اُس کا دم گھٹا ہوا ہے اور اس کی شدّت سے اس کی آنکھیں باہر کو آرہی ہیں۔ میں کوئی چار پانچ برس صدیقی کی اس تنہائی کو قریب سے دیکھتا رہا۔ وہ میرے دیکھتے دیکھتے ہی بوڑھا ہو گیا۔ ایک روز جب وہ بہت گھبرایا گھبرایا سا تھا اور اس کا ماتھا پسینے سے بھیگا ہوا تھا تو میں نے اس کی طبیعت کا پوچھا تو اس نے صرف اتنا کہا۔ "میں اپنی تنہائی سے تھک کے چُور ہو گیا ہوں۔ میری جڑ زمین میں نہیں لگی اور میرے پاؤں ہوا میں مُعلّق ہیں۔"

چند برس بعد جب میں دوبارہ جرمنی گیا تو صدیقی سے ملنے کے لئے اُس کے یہاں پہنچا۔ اس عرصے میں دو مرتبہ اُسے دل کا دورہ پڑ چکا تھا اور وہ اب نحیف حالت میں بستر پر ہی پڑا رہتا۔

میرے وہاں بیٹھے بیٹھے اس کی دونوں بیٹیاں اندر آئیں اور کھڑے کھڑے انہوں نے باپ کو اطلاع دی کہ وہ اپنے بوائے فرینڈز کے ساتھ جا رہی ہیں اور باپ کو صحت اور "خوشگوار شام" کی دعا دیتے ہوئے اپنے دوستوں کے ساتھ چل دیں۔

صدیقی کی طرف میں نے دیکھا اس کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے قطرے ڈھلک کر اس کی پچکی ہوئی گالوں پر لڑھک گئے۔ میں نے خدا حافظ کہنے کیلئے اپنا ہاتھ بڑھایا تو اس کا ہاتھ ٹھنڈا یخ تھا۔ اس کی اُردو اور شعر گوئی سب مرجھا چکے تھے۔ صدیقی کے پاس بیٹھنے کی ہمت مجھ میں نہ رہی تھی اور میں جلدی سے وہاں سے رخصت ہو گیا۔

پھر اک روز پیرس میں امان اللہ خاں سے اچانک سر راہے ملاقات ہو گئی۔ میں شانزے لیزے میں کھڑا نظارۂ حسن کر رہا تھا کہ ایک زوردار ہاتھ میرے بازو پر گرا اور میرا بازو اُس زبردست ہاتھ کی گرفت میں تھا میں نے مُڑ کے دیکھا تو ایک پٹھان، خوش شکل اور روشن نگاہ میرے سامنے کھڑا تھا۔ اُس نے کہا تم مختار ہو؟ میں نے کہا۔ نہیں آپ کو غلطی لگی ہے، میں مختار نہیں ہوں۔" اس پر وہ قدرے خفیف سا ہوا مگر پھر کہا کہ آپ کی شکل ہو بہو میرے دوست مختار سے ملتی ہے اور میں آپ کو دیکھ کر خوشی سے پاگل ہو گیا تھا اور شدتِ جذبات سے میں نے آپ کا بازو اپنے ہاتھ میں دبا لیا۔ میں معافی چاہتا ہوں۔ مگر آپ کے چہرے نے میرے دل میں مختار کی یادیں جگا دی ہیں۔ آپ میرے ساتھ میرے گھر چلئے۔ میں نے ٹالنے کی بڑی کوشش کی مگر وہ کہتا رہا، نہیں مختار کی محبت

کی قسم آپ کو میرے غریب خانے پر چلنا ہو گا آپ میرے گھر آئیں گے تو مجھے یہی لگے گا کہ میرا بچپن کا دوست مختار میرے پاس آگیا ہے - آپ تھوڑی دیر کیلئے مجھے مختار کی صحبت بھی نہیں دے سکتے - میں لاجواب ہو گیا اور امان اللہ خاں کے ساتھ اس کے گھر چل پڑا - سارا راستہ وہ مختار کی باتیں کرتا رہا، کس طرح وہ دونوں ملک سے باہر جانے کے خواب دیکھا کرتے تھے اور کس طرح اکٹھے سفر کے ارادے باندھا کرتے تھے

پھر یوں ہوا کہ مختار کے والد نے ایک دن مختار کی شادی اُس کی چچا زاد بہن سے کر دی اور مختار جو آزاد منش نوجوان تھا، شادی کی زنجیروں میں جکڑ دیا گیا ۔ اس کے باپ کو اُس کے وطن سے باہر چلے جانے کے ارادوں کا علم ہو چکا تھا اور اُس نے یہ اقدام اسی لئے فوراً کیا کہ مختار کو کسی طرح پابند کر دے اور وہ بھاگ نہ سکے ۔

مختار کی شادی سے امان اللہ خاں کو ایسا دھچکا لگا کہ وہ بد دل ہو کر اکیلا ہی ملک سے بھاگ نکلا اور ملک ملک کی خاک چھانتے بالآخر فرانس میں آن کے آباد ہو گیا اُس کی اِس آبادی میں ایک فرانسیسی لڑکی کا ہاتھ تھا یہاں سے امان اللہ خان کی داستان صدیقی کی داستان سے بہت ملتی جلتی تھی - امان اللہ خان اپنی فرانسیسی بیوی کے ساتھ رہ رہا تھا اور اس کے سر اور سینے کے بال کھچڑی ہونے لگے تھے۔

امان اللہ خاں کی بیوی نہایت خوش اخلاق خاتون تھی - اس نے اپنے خاوند کو میرے ساتھ ضرورت سے زیادہ خوش دیکھ کر کسی قسم کی خفگی کا اظہار نہ کیا جو کہ ایسے موقع پر اکثر بیویاں کیا کرتی ہیں بلکہ اپنے شوہر کی خوشی کو دو چند کرنے کے لئے اُس نے مجھے اپنی آنکھوں میں جگہ دی - دیکھتے دیکھتے نہایت

اعلیٰ کھانے سامنے چن دیئے۔ طرح طرح کے میوے سامنے رکھے اور جب تک میں
ان کے درمیان رہا مجھے اپنی ذاتی جمع کی ہوئی فلمیں موسیقی اور سلائیڈز دکھائیں
اور ہر ممکن طریقے سے میری شام کو روشن کر دیا۔ میاں بیوی کے درمیان گزرے
ہوئے یہ لمحات پیرس کی حسین یادوں میں سے ہیں اور میرے سینے پہ یوں ثبت کیے
ہیں۔ جیسے پتھر پہ نقش۔

پیرس میں دو ہفتے کا قیام رہا۔ روزانہ امان اللہ کا فون سرِ شام ہی آجاتا اور وہ
میرے پاس پہنچ جاتا۔ میں نے محسوس کیا کہ میری صحبت میں اُسے ایک عجیب
سا سکون ملتا ہے۔ میں اُس کو ساتھ لے کر پاکستانی دوستوں کے گھروں میں جاتا اور
جب تلک میں وہاں رہتا وہ میرے ساتھ ہی رہتا۔ پاکستانی دوستوں کے
گھروں میں جا کر وہ ان کی بیویوں بیٹیوں اور بہنوں کے درمیان یوں گھل
مل جاتا جیسے وہ ان کو مدت سے جانتا ہو۔ ایسا نہیں تھا، پاکستانی خواتین
کے درمیان بیٹھ کر اسے یوں لگتا تھا جیسے اس کی THERAPY ہو رہی ہے وہ
ان کے ساتھ زیوروں اور کپڑوں کی باتیں کرتا انہیں لطیفے سناتا۔ ہنسا ہنسا کے
ان کے پیٹ میں بل ڈال دیتا۔ خود بھی ان کے ساتھ شامل ہو کے ہنستا۔ اس
دوران وہ مجھے اور میرے پاکستانی دوستوں کو بھی بھول جاتا۔ وہ پاکستانی خواتین
میں بڑا مقبول ہو گیا تھا اور وہ بھی امان اللہ خاں کو اپنے درمیان پا کر اُسی سے
محوِ گفتگو رہتیں۔

جس روز میں پیرس سے روانہ ہو رہا تھا امان اللہ خاں مجھے ایئر پورٹ
پہ چھوڑنے آیا۔ جہاز کے آنے میں اُس روز دو گھنٹے کی تاخیر ہو گئی تھی اور ہم دونوں
ایک صوفے پر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے جہاز کا انتظار کھینچ رہے تھے۔
اچانک میں نے امان اللہ خاں سے پوچھا۔

امان اللہ خان! تمہاری بیوی مجھے بڑی اچھی لگی۔ خوش طبع و خوش گفتار مگر ان چند دنوں میں میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ تم پاکستانی خواتین کی صحبت میں زیادہ خوش رہتے ہو۔

وہ گاڑی کی چابی اپنی انگلی کے گرد گھما رہا تھا۔ میری یہ بات سنتے ہی ایک دم رُک سا گیا اور چابی اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گری۔

اس نے وہ چابی فرش سے اٹھائی اور کمر سیدھی کرتے ہوئے میری طرف دیکھا اور کہا "دوست تم ٹھیک کہتے ہو"

اور پھر امان اللہ خاں کی زبان یوں آزاد ہو گئی جیسے گاڑی کی چابی اس کی انگلی سے آزاد ہو گئی تھی۔ اس نے کہا۔ یار بات یہ ہے کہ شادی وادی ہو گئی۔ سب ٹھیک ہے۔ بیوی محبت بھی بڑی کرتی ہے اور ہے بھی بہت اچھی اور خوبیوں کی مالک، اُس نے پردیس میں میرا ساتھ بھی بہت دیا ہے مگر دوست اُس میں سب کچھ ہے مگر میری مٹی کی مہک نہیں۔ میں کیسے سمجھاؤں، میں کیا کہنا چاہتا ہوں ذرا مشکل بات ہے دیکھو نا جب وہ ہنستی ہے تو اُس کے قہقہوں میں وہ کھنک نہیں جو پختون لڑکی میں ہوتی ہے، جب وہ روتی ہے تو اُس کے رونے میں وہ سسکیاں نہیں جو ہماری لڑکی کے رونے میں ہوتی ہیں، پیار کے رشتے میں بہت سے لفظ ہوتے ہیں جو بے معنی ہوتے ہیں۔ مگر جو پیار کی آگ کو اور بھڑکا دیتے ہیں، کچھ دبی دبی آوازیں ہوتی ہیں جو بہت کچھ کہہ جاتی ہیں مگر وہ تو پشتو میں ہوتی ہیں، میں نے اپنی بیوی کی آواز میں ان آوازوں، سسکیوں اور آدھے لفظوں کو بڑا تلاش کیا وہ مجھے کبھی دکھائی نہیں دیں، کبھی سنائی نہیں دیں، میں جب اپنی بیوی کو پیار کرتا ہوں تو یوں لگتا ہے۔

پیار نہیں کر رہا، پیار کا فرانسیسی میں ترجمہ کر رہا ہوں۔ میری بات سمجھے ہو اگر تمہیں

پیار کا کوئی تجربہ ہے تو تمہیں سمجھ میں آجائے گا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ گھر بسا کر بھی اکیلے کا اکیلا ہوں۔ بڑا تنہا ہوں ۔ لگتا ہے پوری زندگی ترجمے کی نذر ہو گئی ہے وہ بولے جا رہا تھا کہ اتنے میں جہاز کی آمد کا اعلان ہو گیا اور وہ جو اتنے برس سے وہاں رہ کے بھی تنہا محسوس کر رہا تھا میں اس کو خدا حافظ کہہ کے مزید تنہا کر رہا تھا "خدا حافظ امان اللہ! میں کوشش کروں گا کہ تمہیں اُن آوازوں کی ٹیپ بھجواؤں جن کو تم بہت مس کر رہے ہو! اب ٹیپ نے زندگی کی بہت سی کمیاں پوری کر دی ہیں ۔ شاید تمہیں انہیں سن کر کچھ افاقہ ہو ۔ جاؤ اب ۔ تمہاری پیاری بیوی گھر میں تمہارا انتظار کر رہی ہوگی ۔ خدا حافظ امان اللہ خان "مختار" کی خدمت کا شکریہ" امان اللہ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں اور وہ ان پر رومال رکھ کر پلٹ گیا اور دور تک اکیلا جاتا ہوا دکھائی دیتا رہا۔

اور پھر ایک مرتبہ لندن میں اپنے دوست حامد کے ہاں ٹھہرا ۔ حامد سے تیس برس بعد ملاقات ہو رہی تھی اس کے تین بچے تھے ۔ دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ۔ سلمیٰ ان سب میں بڑی تھی ۔ تینوں خوبصورت تھے مگر سلمیٰ ان میں سب سے زیادہ دلکش اور ہوشیار تھی۔ وہ چوبیس کے پیٹے میں تھی باقی دو بچے بیس اور سولہ برس کے تھے یہ سارے بچے لندن ہی میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے تھے انہوں نے اپنے باپ کا وطن بھی کبھی نہ دیکھا تھا حامد کی بیوی بھی پاکستانی تھی ۔ حامد کا کاروبار نہایت عمدہ چل رہا تھا، بچوں کی تعلیم بھی اچھے سکولوں میں ہو رہی تھی، ہر لحاظ سے یہ ایک خوشحال گھرانہ تھا مگر حامد اور اس کی بیوی دونوں مجھے پریشان سے لگتے جیسے کوئی بوجھ مستقل ان کے سروں پر گرا ہوا ہے اور وہ اس بوجھ تلے سسک رہے ہیں مگر منہ سے کچھ نہیں کہتے ۔

ایک روز جب بچے گھر پہ نہیں تھے میں نے حامد اور اس کی بیوی سے پوچھا کہ میں جب سے آیا ہوں آپ کے چہروں پر ایک مستقل کھچاؤ محسوس کیا ہے اللہ کا دیا سب کچھ ہے مال، دولت اولاد، زندگی کی سب سہولتیں بھی میسر ہیں آپ کیوں خوش خوش دکھائی نہیں دیتے۔

حامد نے بیوی کی طرف دیکھا۔ اُس نے نظریں نیچی کر لیں اور کچھ بولنے کی بجائے سر نیچا کر لیا۔ اس خاموشی سے میں پریشان سا ہو گیا اور کچھ کچھ شرمندہ بھی کہ شاید میں نے کوئی نامناسب بات کہہ دی ہے۔

میری پریشانی کو دیکھ کر حامد بولا۔ بھئی تم جانتے ہو کہ سلمیٰ جوان ہو چکی ہے اور اس کی شادی اب تک نہیں ہو رہی۔ میں نے سلمیٰ اور دوسرے بچوں کو اس طرح پالا ہے جیسے وہ پاکستان میں ہوں۔ سلمیٰ بڑی ہو چکی ہے اور اب تک میں اُسے اکیلا پکچر یا تھیٹر پہ نہیں جانے دیتا ہوں، اُس کو کسی غیر مرد سے بھی ملنے نہیں دیا تاکہ وہ "بوائے فرینڈز" کے چکر میں نہ پڑے۔ میں نے اس کی ہر طرح سے حفاظت کی ہے اور اسے سوشل ہونے کی مہلت ہی نہیں دی۔ اس اُمید پر جی رہا ہوں کہ کوئی مناسب سا رشتہ آئے تو میں اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو جاؤں۔

سلمیٰ کی عمر بھی زیادہ ہوتی جا رہی ہے مگر یہاں کوئی اس خیال سے قدم ہی نہیں دھرتا کہ وہ رشتے کی بات کرے۔ اس فکر نے مجھے اور میری بیوی کو کھا لیا ہے۔

میں یہ سُن کر چپ ہو گیا ایک روز ڈرائینگ روم میں سلمیٰ اور میں بیٹھے ٹیلیویژن پہ کوئی پروگرام دیکھ رہے تھے کہ سلمیٰ نے مجھے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ انکل۔ آپ جا رہے ہیں۔ مگر ڈیڈی کو ذرا سمجھاتے جائیں۔

میں نے کہا: سلمیٰ! کہو کیا کہنا چاہتی ہو میں حامد سے ضرور کہوں گا۔ سلمیٰ میرے نزدیک آگئی اور میرے سینے پر سر رکھ کے ایک دم رو دی میں نے اُس کے سر کو اپنے سینے سے الگ کیا ـــــ "سلمیٰ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ رو کیوں رہی ہو؟"

سلمیٰ نے کہا۔" انکل، ڈیڈی کچھ نہیں سمجھتے۔ انہوں نے ہمیں پاگل کر دیا ہے۔ انگلستان میں رہتے ہیں مگر گھر کے اندر پاکستان بنایا ہوا ہے۔ آپ ہی بتلائیے یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے اگر پاکستان بنانا تھا تو پاکستان ہی میں رہتے۔ وہ تو رہتے ہیں ایک بالکل ہی دوسری تہذیب میں اور گھر میں ایک جزیرہ آباد کیا ہوا ہے پاکستانی تہذیب کا۔ مجھے نہ کسی سے ملنے دیتے ہیں، نہ بات کرنے دیتے ہیں۔ ایک پاکستانی لڑکا، ہوائی جہازوں کی کمپنی میں کام کرتا تھا۔ مجھے بہت اچھا لگتا تھا مگر میں ڈیڈی سے کہہ نہ سکی۔ میں کہہ دیتی تو شاید وہ اپنے آپ کو ختم کر دیتے کہ یہ تو ان کی شکست ہو گئی۔ انکل! میں صرف پاکستانی ماں باپ کے گھر پیدا ہوئی ہوں، مگر پاکستان کو میں نے نہ دیکھا نہ اس کے بارے میں کچھ جانتی ہوں۔ جب یہ صورتِ حال ہو تو میرا پاکستانی ہونا تو صرف ایک حادثے کا نتیجہ ہے، حادثہ یہی ہے کہ پیدا انگلستان میں ہوئی مگر پاکستانیوں کے گھر۔ میری جڑیں تو انگلستان میں ہیں اور میں یہیں پھلی پھولی ہوں۔ اب ڈیڈی چاہتے ہیں کہ اس درخت کو یہاں کی ہوا نہ لگے۔ میری زندگی برباد ہوتی جا رہی ہے۔ نہ میں پاکستان میں ہوں اور نہ یہ مجھے انگلستان میں رہنے دیتے ہیں۔ کسی روز میں خودکشی کر لوں گی اور میری لاش آپ کو پاکستان اور انگلستان کی سرحد پر پڑی ہوئی ملے گی اور ڈیڈی مجھے پاکستانی رسوم کے مطابق دفن کر کے سکون کا سانس لیں گے کہ اس کا خاتمہ تو پاکستانی انداز میں ہوا۔" سلمیٰ زور زور سے رونے لگی۔ میں

نے اس سے وعدہ کیا کہ میں حامد کو پاکستان سے انگلستان واپس لانے کی پوری کوشش کروں گا اس لئے کہ وہ یہاں آ چکنے کے بعد بھی ابھی تک وہیں رہ رہا ہے جب تلک وہ یہاں آ نہیں جائے گا وہ آپ کو بھی انگلستان میں "آباد" نہیں ہونے دے گا۔

میں نے حامد سے ایک روز تنہائی میں کہا۔

"حامد! تم پاکستان کے پودے کو لندن میں لگانے کی کوشش کر رہے ہو اور یہ بھول گئے ہو کہ جس آب و ہوا میں یہ پودا اگ سکتا ہے وہ تو یہاں نہیں ہے یہاں کی آب و ہوا تو پاکستان کی آب و ہوا سے بالکل مختلف ہے۔ اس پودے کی طرح پاکستان بھی وہیں پھل پھول سکتا ہے جہاں یہ وہ ہے۔ تم اس کی گاچی بنا کر دوسرے ملک میں اسے نصب کرنا چاہتے ہو! یہ ایک غیر فطری عمل ہے تم نے اپنا گھر چھوڑ دیا اب اس کے نتائج جو بھی ہوں ان کا سامنا تمہیں کرنا ہو گا۔ تمہارا نیا گھر، پرانے گھر جیسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ اپنے کئے کی سزا اپنے بچوں کو مت دو۔"

حامد منہ کھولے میرے چہرے کو تکے جا رہا تھا جیسے میں اُسے کہہ رہا ہوں کہ سلمیٰ کو اپنے من پسند کے لڑکے کو منتخب کرنے کا حق ہے، وہ اپنے دوست کے ساتھ تفریح کے لئے باہر جا سکتی ہے، وہ اپنا جیون ساتھی خود چن سکتی ہے وہ بالغ ہے اور انگلستان کی تہذیب میں اس نے آنکھیں کھولی ہیں، وہ انگلستان میں پیدا ہونے والی دوسری لڑکیوں کی طرح ہے صرف اس کے باپ کا نام حامد ہے جو ایک پاکستانی ہے۔ حامد جو اپنے بچوں سے دور ہو چکا ہے اور تنہا ہو گیا ہے۔

اب جبکہ میں واپس وطن آ چکا ہوں تو کبھی کبھی صدیقی، امان اللہ خاں

اور حامد کے چہرے میری آنکھوں کے سامنے آتے ہیں تو ان کی تنہائیوں کے خیال سے مجھے وحشت ہونے لگتی ہے پھر اچانک ان چہروں کے درمیان شفیق کا چہرہ سامنے آجاتا ہے جو اپنی نواسی کو اپنے پیٹ پر لٹائے اسے گدگدی کر رہا ہے اور اس کی ننھی سی نواسی جب ہنستی ہے تو شفیق کی بوڑھی رگوں میں جوانی کا تیز لہو گردش کرنے لگ جاتا ہے اور اس کی نواسی کے قہقہوں کی گونج اُس کے بڑھاپے کی تنہائیوں کو کاٹ کے رکھ دیتی ہے۔

بند گٹھڑی

وہ ایک منجھا ہوا صحافی تھا۔ اہم شخصیتوں سے انٹرویو کرنے میں اُس نے خاصا کمال حاصل کر لیا تھا تھا۔ بڑے بڑے بُتوں کو اُس نے توڑ کے ان کے اندر کا کھوکھلا پن اُن کے پوجنے والوں کو دکھلایا، کچھ ایسی شخصیتیں جو بند گٹھی کی طرح تھیں، انہیں اس طرح کھولا کہ ایک ایک تار الگ کر دیا۔ روشن چہروں کے اندر چھپی ہوئی سیاہیوں کو آشکار کیا۔ انسانی نفسیات کو سمجھنے میں اُسے ایک مہارت حاصل تھی اور اُس کے انٹرویوز محض اخباری انٹرویوز نہ ہوتے تھے بلکہ ان کے اندر ایک گہرائی ہوتی تھی جو پڑھنے والوں کو متاثر کرتی۔ اسی وجہ سے اس کے انٹرویوز کا بڑا چرچا تھا۔

ایک روز وہ مجھے کیفے ٹیریا میں ملا۔ بڑا پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ چھوٹتے ہی بولا کہ کئی دنوں سے آپ کی تلاش تھی۔ ایک عجیب مسئلہ آن پڑا ہے۔ مسئلہ نہیں، ایک مصیبت کہہ لیجئے۔ ایک عرصے سے انٹرویو لے رہا ہوں۔ اب تو یہی ایک میرا پیشہ رہ گیا ہے۔ مگر وہ ڈرامہ آرٹسٹ عجیب

شے ہے کہ میرے قابو ہی میں نہیں آرہی۔ میں نے اُسے کہا کہ تمہارے
انٹرویو کے لئے یہ ضروری ہے کہ میں ایک ہفتہ تمہارے ساتھ رہوں۔ تمہیں
گھر کے اندر، گھر کے باہر، سٹوڈیو میں، دوستوں کے ساتھ، رشتہ داروں کے
درمیان، بازار میں خرید و فروخت کرتے ہوئے، کھانا کھاتے، اُٹھتے بیٹھتے
پڑھتے، ہر انداز میں دیکھوں اور مختلف موضوعات پر باتیں کروں تاکہ تمہاری
ایک مکمل تصویر میرے ذہن میں بن سکے۔ وہ بولی۔ بڑے شوق سے آپ میرا
مطالعہ فرمائیں لیکن یہ یاد رکھئے گا کہ صحافی لوگوں سے میرا لَو ہیٹ (LOVE HATE
قسم کا رشتہ ہے۔ میں ان سے نفرت کرتی ہوں۔ جب یہ سکینڈل بازی کرتے
ہیں اور فن پر کوئی بات کرنے کی بجائے ذاتیات پر اُتر آتے ہیں۔" مگر آپ ان
سے محبّت کرتی ہیں جب وہ آپ کی تعریف کرتے ہیں اور قوم کا ہیرو بنا کے
پیش کرتے ہیں"، میں نے اس کا جملہ پورا کرتے ہوئے کہا۔ پر صاحب بات یہ ہے
کہ ایک ہفتہ اس کے ساتھ گزارنے کے بعد میں اُسی مقام پر ہوں جہاں میں
اُسے ملا تھا اور اس سے کہا تھا کہ تمہیں سمجھنے کے لئے کم از کم ایک ہفتہ مجھے
چاہیئے ہوگا۔ میرا مطلب ہے میں ابھی نقطۂ آغاز ہی پر بیٹھا ہوا ہوں، وہ عورت
میری سمجھ ہی میں نہیں آرہی۔ اُسے لفظوں میں گھیرنے کی کوشش کرتا ہوں تو وہ
ہاتھ سے یوں نکل جاتی ہے جیسے پانی میں سے مچھلی۔ عجب مصیبت میں گرفتار
ہوں۔ آپ سے بات کر رہا ہوں تاکہ میرے دماغ کا بوجھ کچھ تو ہلکا ہو۔ عجیب
عورت ہے خدا کی قسم۔ ایک بند گٹھڑی۔

میں نے اُس کی پریشانی کو دیکھا تو کہا۔" تم ایک تجربہ کار آدمی ہو، ہفتے
بھر میں جو دیکھا ہے وہ لکھ دو اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔"
"پریشان ہونے کی بات یہ ہے کہ وہ مجھ سے کھلتی ہی نہیں۔ کوئی ایسی

سخت گرہ ہے کہ ناخنِ تدبیر بھی گھس گیا ہے مگر وہ اپنی جگہ پہ ٹس سے مس نہیں ہوئی"۔

"وہ تمہیں کب ملی اور کیسے ملی تھی؟"

"جی؟ ہاں یہ بھی عجیب قصہ ہے۔ ایک روز دفتر کے فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے فون اُٹھانے کے لئے ابھی ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اتنے میں ٹھک سے دفتر کا دروازہ کھلا اور وہ ایک سات سال کے بچے کی اُنگلی پکڑے میرے سامنے کھڑی تھی۔

میں نے ریسیور وہیں رکھ دیا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے اُسے پہچان لیا تھا۔ وہ ایک معروف ڈرامہ آرٹسٹ تھی اور کئی برسوں سے سٹیج اور فلموں میں پرکام کر رہی تھی۔ وہ سامنے والی کرسی پر خود سے بیٹھ گئی اور اپنے ساتھ اس بچے کو بھی دوسری کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔

"یہ آپ کا بیٹا ہے؟" میں نے پوچھا۔

اُس نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں۔ میری بہن کا ہے۔ مجھے آپ سے ملنا تھا تو اس بچے کو بھی ساتھ لیتی آئی"۔

"یہ اُس نے کچھ اس طرح سے کہا جیسے مجھ سے اکیلے ملنا کوئی غیر مناسب سی بات تھی۔ لہٰذا اپنے ساتھ ایک اور جاندار کو بھی ساتھ نتھی کر لیا کہ وہ "محافظ" کا کام دے۔ وہ بچہ جو سات سال کا تھا اس "محافظ" کے رُوپ میں اس کی موجودگی مجھے بہت بُری لگے گی اور مجھے اس خاتون پر حیرت ہوئی کہ جو اچھا خاصا نام بھی کما چکی تھی اور پروفیشن میں طرح طرح کے آدمیوں کے ساتھ ایکٹ بھی کر چکی تھی، ایک صحافی سے اکیلے نہیں مل سکتی؟ سچی بات ہے کہ مجھے اُس کی یہ حرکت بہت بُری لگی۔ پہلی مرتبہ ملنے کو آئی ہے اور ساتھ ایک

"محافظ"، بھی انگلی سے لگایا ہوا ہے۔ یعنی آپ ذرا غور تو فرمائیے کہ اپنی شرافت کا اشتہار دینے کے لئے ایک سات سال کا معصوم سا بچہ استعمال کیا جا رہا ہے۔" اس کی بڑھتی ہوئی پریشانی دیکھ کر میں مسکرا دیا۔ "آپ مسکرا رہے ہیں۔ یقین کیجئے سچ کہہ رہا ہوں آپ سے! خدا کی قسم میرا جی چاہا کہ میں اسی وقت اسے دفتر سے باہر نکال دوں پھر خیال آیا نہیں۔ عورت ذات ہے۔ سٹیج کے علاوہ زندگی میں کبھی کبھی ایکٹنگ کی ضرورت محسوس کرتی ہو گی۔ چلو چھوڑو۔ جانے دو۔"

"پھر کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"ہونا ہوانا کیا تھا۔ اس نے کہا میں نے آپ کے انٹرویوز پڑھے ہیں اور ان انٹرویوز سے انٹرویو دینے والوں کی وہ شہرت ہوئی ہے کہ میں نے سوچا کہ ایک انٹرویو آپ میرا بھی کر لیں۔ دیکھئے نا! آپ لاکھ اچھے آرٹسٹ ہوں لیکن اگر آپ کی پبلسٹی نہ ہو تو کوئی پوچھتا نہیں۔ یہ زمانہ ہی پی۔ آر کا ہے۔ آپ مجھ پر لکھیں گے تو شاید میرا نام کسی ایوارڈ کے لئے بھی زیرِ غور آ جائے۔ میں معافی چاہتی ہوں جو کچھ میں آپ سے کہہ رہی ہوں مگر آپ بڑی اچھی طرح جانتے ہیں کہ بغیر شہرت کے فی زمانہ کوئی بات نہیں بنتی اور اسی شہرت کی خاطر ہی تو یہ سارا کھیل ہو رہا ہے۔"

"پہلے تو مجھے خیال آیا کہ اس نیک خاتون سے کہوں کہ بی بی! اہلِ فن کو تو اپنے فن کی فکر ہونی چاہیئے۔ شہرت تو فن کے راستے کا پتھر ہے۔ فن میں قوت ہو تو پبلسٹی فنکار کے پیچھے خود بھاگتی ہے۔ پھر سوچا کہ نہیں کچھ بھی ہے وہ ایک فنکار تو ہے اور اس کا حق ہے کہ اسے پہچانا جائے۔ اب تو یہ وقت آن لگا ہے کہ ٹی وی اور ریڈیو پر خبریں پڑھنے والوں اور اناؤنسروں کو سکولوں

اور کالجوں میں انعامات تقسیم کرنے کے لئے مہمانِ خصوصی کے طور پر بلایا جاتا ہے اور ان کے ساتھ شامیں منائی جانے لگی ہیں اور یہ بے چاری بہر حال صاحبِ فن تو ہے۔" تو جناب بات لمبی ہوتی جا رہی ہے۔ آپ نے پوچھا کہ وہ مجھ سے کب ملی اور کیسی ملی تو میں نے کہا ذرا اس کی شانِ نزول بھی بیان کر دوں"۔

"بیان جاری رکھو"۔ میں نے اُسے حکم دینے کے انداز میں کہا۔ وہ مسکرا دیا اور بولا: "تو جی ہاں یوں میں نے فیصلہ کیا کہ اس کا انٹرویو ہو جائے۔ چنانچہ میں نے اُسے کہا کہ ایک ہفتہ میں تمہیں سٹڈی کروں گا۔ پھر اس کے بعد ہی کچھ لکھا جا سکے گا اور جیسا کہ میں نے آپ کو بتلایا، اس نے میری اس تجویز کو بخوشی قبول کر لیا"۔

"دوسرے روز میں اُس کے گھر میں تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ میری موجودگی کا بالکل نوٹس نہ لے اور گھر کے اندر وہ جس طرح اپنا دن گزارتی ہے، اسی طرح کام وغیرہ میں لگی رہے۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دے۔ اس نے کہا: ہاں آپ چائے وغیرہ پیجئے، پھر دوپہر کا کھانا آپ میرے گھر والوں کے ساتھ شامل ہو کے کھائیے، درمیان میں سونا ہو تو بلا تکلف سو جائیے گا۔ بہر حال آپ کی جیسے بھی مرضی ہو۔ اس گھر کو اپنا ہی گھر سمجھئے گا۔

"چنانچہ میں ڈرائینگ روم میں اخبار لے کے بیٹھ گیا۔ وہ صفائی کا کہہ کے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کے گنگنانے کی آواز آئی جو بلند ہوتی گئی اور وہ باقاعدہ گانے لگی۔ اس کی آواز اچھی تھی۔ اگرچہ اپنے ڈراموں میں اس نے کبھی کچھ نہ گایا تھا۔ "ڈسکو دیوانے — دیوانے — دیوانے"۔ اس گانے کے درمیان وہ لمبی لمبی سسکیاں بھی لیتی۔ پتہ چلا کہ اسے پوپ میوزک سے لگاؤ ہے اور اپنی صبح کا آغاز وہ اسی قسم کی پاپولر دھنوں سے کرتی

ہے۔

تھوڑی دیر بعد وہ ڈرائینگ روم میں چلی آئی ۔ میں نے اُس کی آواز کی تعریف کی تو وہ بڑی خوش ہوئی اور کہنے لگی کہ اِس مقبول گانے کے ساتھ ساتھ وہ ناچتی بھی ہے۔ پھر فوراً رُک گئی جیسے کسی ضابطے کی خلاف ورزی ہو گئی ہو۔ نہیں نہیں صرف گھر میں ہی ناچتی ہوں باہر بالکل نہیں۔ آپ کہیں غلط نہ سمجھ لیجئے گا۔ میں اسی بات سے ڈرتی ہوں۔ لوگ ذرا سی بات کو لے اڑتے ہیں اور رائی کا پہاڑ بنا دیتے ہیں۔ ناچنا اگرچہ کوئی غیر فطری فعل نہیں لیکن آپ جانتے ہیں کہ ہمارے یہاں لڑکیوں کا ناچنا اچھا نہیں سمجھا جاتا۔"

"اور مردوں کا ناچنا؟" میں نے پوچھا۔

"مردوں کو اجازت ہے۔ وہ بھنگڑے ڈال سکتے ہیں، لُڈی ڈال سکتے ہیں۔"

"تو زور کس پر ہوا؟" میں نے سوال کیا۔

"اجازت پر"—— وہ بے اختیار بولی اور پھر کھِلکھِلا کے ہنس پڑی "دیکھئے نا! یہ معاشرہ بالآخر مردوں کا معاشرہ ہے۔ اللہ کو بھی میاں ہی کہتے ہیں۔ بہرحال ہمیں جینا تو ہے جیسے تیسے بھی ہو۔ کوئی دُھن اچھی لگی اس پر گھر بیٹھے ہی پاؤں کے ساتھ تال دے دی اور جی خوش کر لیا۔ پھر وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ دیکھئے اس کے بارے میں کچھ لکھئے گا نہیں۔ ناچ گانا تو آپ جانتے ہیں ناں شرفاء کا کام نہیں۔"

"اُس کے چہرے کی رنگت دیکھ کے مجھے خوف سا آ گیا۔ وہ زرد ہو رہا تھا۔ ایک لمحے کے لئے ایسے لگا کہ ہمارے سروں پر سارا آسمان زرد ہو گیا ہے اور فضا میں مشک کافور کی بو پھیل گئی ہے میں نے جلد ہی موضوع بدلا اور اسے پوچھا: تمہارے باپ کا کیا نام ہے؟ کچھ اپنے خاندانی پس منظر کے بارے میں

بتلاؤ۔ اس سوال پر اس کا رنگ اور گہرا زرد ہوگیا۔ جیسے میں نے کوئی ایسی بات پوچھ لی ہے جو نہیں پوچھنا چاہیئے تھی۔ میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ وہ بولی۔ وہ مر چکا ہے۔ یہ سن کر میں خاموش ہوگیا۔ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ ڈالی وہ ایک گہرے تأسف کے ساتھ نظریں نیچی کئے زمین کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اُس کے چہرے کے نقوش اِس کیفیت میں بہت واضح ہو گئے تھے اور مجھے محسوس ہوا کہ یہ نقوش تو ایک نامی گرامی فن کار کے ہیں جو بین الاقوامی شہرت کا مالک ہے۔ میں نے بے اختیار اُس سے پوچھنا چاہا کہ وہ اُس آرٹسٹ کی بیٹی تو نہیں ہے؟" مگر نہ جانے کیوں میری زبان رُک گئی۔ اگر یہ اُس آرٹسٹ کی بیٹی نہ ہوئی تو کہیں یہ اس بات سے ناراض نہ ہو جائے کہ میں نے اُسے ایک ایسے شخص کی بیٹی سمجھ لیا جو فنکار ہے اور "شرفاء" میں شمار نہیں ہوتا۔

دوپہر کے کھانے پر جب بیٹھے تو اُس کی ماں میرے برابر آن بیٹھی اور اُسے اشارے سے کہا ذرا ٹھنڈا پانی بنا کے لاؤ۔ جب وہ پانی لینے کو گئی تو ماں نے بڑے رازدارانہ لہجے میں میرے کان میں کہا: بیٹا تم اخبار والے ہو۔ اس کے باپ کا ذکر وِکر نہ کرنا۔ وہ زندہ ہے مگر ہمارے لئے مر چکا ہے۔ لڑکی ہے اور جوان ہے۔ باپ سر پر نہ ہو تو لوگ ہزاروں کہانیاں بنانے لگ جاتے ہیں۔ بس اس بارے میں کچھ بھی نہ کہو۔

میں خاموش ہوگیا۔

کھانے کے بعد ہم پھر ڈرائینگ روم میں آگئے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں شروع ہوئیں۔ باتوں باتوں میں میں نے اسے پوچھا کہ چھ سال ہوئے میں نے اخبار میں تمہاری شادی کی خبر کہیں دیکھی تھی مگر تم تو گھر میں اکیلی دکھائی دے رہی ہو؟

"تو تمہاری شادی نہیں ہوئی کیا؟"

خاموشی

"میرا خیال ہے میں نے اخبار میں ضرور پڑھا تھا"

خاموشی

"اخبار والے بعض اوقات ایسے ہی اُڑا دیتے ہیں" میں نے اس کی خاموشی سے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ میری شادی نہیں ہوئی" وہ بالآخر بول پڑی۔

"اچھا تو پھر مجھے غلطی لگی ہوگی" میں نے معذرت کے لہجے میں کہا۔ مگر جب میں نے اُس کے چہرے کی طرف دیکھا تو مجھے لگا کہ اُس کا چہرہ اُس کے الفاظ کی تصدیق نہیں کر رہا۔ اس کے چہرے اور الفاظ میں اتنا ہی بُعد تھا جتنا سچ اور جھوٹ میں۔ اُس کی شادی یقیناً کسی حادثے کا شکار ہو چکی تھی۔ مگر ایسی کیا بات تھی۔ کئی شادیاں ہو کر ٹوٹ جاتی ہیں۔ ان پر پردہ ڈالنا اور شادی کے حادثے کو چھپا چھپا کے رکھنا کسی خوف کا نتیجہ ہی ہو سکتا ہے۔

"باپ کی ذات کے بعد یہ دوسرا پردہ تھا جو اب خاوند کے وجود پر ڈال دیا گیا تھا، وہ خاوند جو زیادہ دیر اُس کے ساتھ سنگت نہ کر سکا تھا۔ میری حیرت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور مجھے سخت جھنجلاہٹ سی ہونے لگی کہ وہ مجھے اپنے بارے میں انٹرویو دینا چاہتی تھی مگر ہر چیز کو چھپائے چلی جا رہی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنی زندگی کی حقیقتوں کو ناقابلِ ذکر سمجھ کر اُن پر گہرے غلاف کیوں ڈال رہی ہے؟ یہ کیا کمپلیکس ہے؟ پھر میں نے سوچا کہ وہ ایک مدت سے زندگی کو ایکٹ کر کے زندہ رہی ہے، زندہ ہی نہیں رہی بلکہ اس میں شہرت بھی کما رہی ہے، شاید اب یہ ایکٹنگ سٹیج اور فلم کے

سلولائیڈ سے اُتر کر زندگی میں بھی در آئی ہے اور اب حقیقت اور ایکٹنگ آپس
میں کچھ یوں گڈمڈ ہو گئے ہیں کہ سٹیج اور زندگی میں کوئی فرق نہیں رہا۔ اب وہ
سٹیج سے اُتر کر بھی ایکٹ ہی کر رہی ہے اور اس ایکٹنگ ہی کو زندگی سمجھنے
لگی ہے۔

"میں نے اب فیصلہ کیا کہ اُسے اب میں کچھ نہیں پوچھوں گا۔ بس چپکے
سے دیکھوں گا کہ اُس کے لیل ونہار کیسے ہیں۔ اسی سے اگر کوئی بات بن گئی تو
ٹھیک ورنہ پھر خاموش ہو رہیں گے۔

"شام کو اسے شاپنگ کے لئے انار کلی جانا تھا۔ میں اس کے ساتھ ہو
لیا۔ دروازے سے نکلتے وقت اس نے سات سالہ بھانجے کو آواز دی اور
اسے بھی ساتھ کر لیا۔ کپڑوں کی ایک دوکان پر جا کے ہم رُکے۔ اس نے کپڑوں
کا انتخاب شروع کیا اور تین گھنٹے کبھی یہ تھان کھلوا۔ کبھی وہ، پھر بھاؤ پر جھگڑا،
آخر کو چھ سات سوٹ کٹوا کر اُس نے ایک طرف کو بندھوا کے الگ رکھوا دیئے
اور دوکاندار سے کہا کہ وہ کل آئے گی اور پیسے ادا کر کے لے جائے گی۔

دوسرا دن پھر "ڈسکو دیوانے" سے شروع ہوا اور چائے کے بعد اس
نے اعلان کیا کہ آج لبرٹی مارکیٹ اور مال روڈ پر چیزیں خریدنا ہیں آپ
بھی چلئے۔ ہم لبرٹی مارکیٹ گئے۔ جوتوں کی ایک دکان میں داخل ہوتے اس
نے کوئی دو گھنٹے کی طوالت کے بعد چھ جوڑے سینڈلز کے پسند کئے۔ ان کے
بھاؤ طے کرنے میں مزید ایک گھنٹہ اور صرف کیا اور پھر وہی پچھلے دن والا سین۔
دوکاندار سے کہا کہ وہ انہیں باندھ کر ایک طرف رکھ دے۔ وہ کل صبح آئے گی
اور پیسے دے کے جوتے لے جائے گی۔ مال روڈ پر جیولر کی دوکان پر بھی
یہی سین دُھرایا گیا۔ طرح طرح کے زیور پہن کر اس نے شیشے میں اپنے آپ

کو دیکھا۔ کبھی کبھی مجھ سے بھی داد لی اور آخر کو تین چار ڈبے بندھوا کر ایک طرف کر دیئے اور جیولر سے کہہ کر کہ وہ کل آئے گی اور رقم ادا کر کے لے جائے گی۔ مگر وہ کل کبھی نہ آئی۔ تیسرے روز بھی یہی ڈرامہ ہوا۔ گٹھڑی کا بندھوانا اگلے روز آنے کا وعدہ اور پھر چوتھے روز کسی اگلی دوکان میں اسی ایکٹ کا دُھرانا۔

"ڈرامے کے اِس سین کو مسلسل دیکھ دیکھ کے میرا ستیاناس ہو گیا تھا اور ایک دن میں نے اُسے تنگ آ کے یہ کہا کہ جب خریداری نہیں کرنا ہوتی تو پھر گٹھڑیاں بندھوانا اور وعدہ فردا پر چھوڑ آنا، نہایت فضول حرکت ہے اور اس میں بدنامی بھی ہے۔ اس پر اس نے بڑی بے اعتنائی سے جواب دیا۔ "کیا فرق پڑتا ہے۔ دوکانداروں کے یہاں گاہک آتے ہی رہتے ہیں اور چیزیں دیکھ کے چلے جاتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ انہیں خریدا بھی جائے۔" ایسے لگتا تھا کہ حقیقت اور ڈرامہ آپس میں ہر جگہ گڈمڈ ہو گئے ہیں اور جیسے یہ اُس کے بس میں ہی نہیں کہ وہ ان دونوں میں تمیز کر سکے۔ وہ نہایت کنفیوزڈ سی خاتون دکھائی دیتی تھی۔ جونہی میں اسے ذرا سنجیدگی سے لینا شروع کرتا تو پتہ چلتا کہ وہ تو ایکٹنگ کر رہی ہے۔ ایکٹنگ کا مطلب ہرگز دوسروں کو اُلّو بنانا نہیں ہوتا مگر وہ بے چارے دوکاندار تو اچھے خاصے اُلّو بنائے جا رہے تھے اور اب اِن اُلّوؤں میں میں بھی اپنے آپ کو شمار کرنے لگ پڑا تھا۔

"اب میں اُس کی حرکات کو چُپکے چُپکے ہی دیکھتا جا رہا تھا مگر منہ سے کچھ نہ کہتا تھا۔

"اب ہفتے کا آخری دن آ چکا تھا۔ ہم اُس کے گھر کے برآمدے میں

بیٹھے تھے کہ ایک ننھا سا پیارا بچہ دوڑتا دوڑتا آیا اور "ممی - ممی"، کہتا ہوا اس کی گود میں گر گیا - میں نے اُس کی طرف دیکھا تو اس کا چہرہ ایک دم سفید ہو گیا اور خون چہرے سے یکسر غائب اور وہ بالکل سپاٹ اور بے حرکت ہو گیا تھا - وہ ایسے پریشان ہو گئی جیسے کوئی بند گٹھڑی اچانک کھل جائے اور اس میں بندھی ہوئی تمام چیزیں فرش پر بکھر جائیں - اس نے مجھے مخاطب ہوتے ہوئے کہا: یہ ہمارے ہمسائیوں کا بچہ ہے - مجھ سے بڑا پیار کرتا ہے اور ممی ممی کہہ کے مجھے بلاتا ہے - میں نے اسے کئی دفعہ سمجھایا ہے کہ میں تمہاری ممی نہیں ہوں مگر یہ نہیں رُکتا - پھر اس نے بچے کو گود سے جھٹک کر الگ کرنا چاہا مگر اُس نے اپنے بازو اُس کی کمر میں زور سے ڈال دیئے اور یہی کہے جا رہا تھا - نہیں آپ ہی میری ممی ہیں - میری اور کوئی ممی نہیں - میری ممی - میری ممی - میری ممی - وہ اُسے الگ کرنے کی کوشش کرتی اور جب اسے زور کی ڈانٹ پڑی تو وہ سہم کر ایک طرف کو کھڑا ہو گیا - بچے کی آنکھوں میں آنسو تھے اور جب میں نے "ممی" کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں سے دو بڑے قطرے اس کے رخساروں پر بہہ نکلے - اس نے مجھے کانپتی ہوئی آواز میں کہا: اس کا ذکر نہ کیجئے گا - یہ بچے کا پیار ہے - اس سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں - اتنا کہہ کر وہ یک لخت چُپ ہو گئی اور پھر بڑی دیر تک یونہی چُپ رہی -

"حقیقت وہی تھی جو آنسوؤں نے کہہ دی تھی - باپ اور خاوند کے بعد ایک پردہ اب بیٹے کے وجود پر بھی پڑ گیا تھا - وہ شدید خوف کے عالم میں دکھائی دے رہی تھی اور اس کے چہرے سے یوں لگتا تھا کہ اب وہ کچھ نہیں کہنا چاہتی - مجھے یوں لگا جیسے یہ تمام رشتے وہ گٹھڑیاں ہیں جنہیں وہ بڑے شوق سے بندھوا کے دوکانوں پہ چھوڑ آتی تھی اور پھر ان کی ملکیت قبول

کرنے سے بھاگ جاتی تھی۔ یہ رشتے بند گٹھڑیوں کی طرح کونوں میں بندھے پڑے تھے اور ان گٹھڑیوں کو اٹھانے اور کھولنے کی ہمت اُس میں نہ تھی۔ ان گٹھڑیوں میں اُس نے بڑے شوق سے چُن چُن کے چیزیں رکھیں تھیں، ان میں اس کے چاؤ تھے، اس کی خواہشیں اور امنگیں تھیں جو گانٹھوں کے اندر بند تھیں۔"

یہ کہہ کر وہ چپ ہو گیا۔ پھر بولا "اب آپ ہی بتلائیے کہ میں انٹرویو میں کیا لکھوں۔ وہاں تو ہر چیز گٹھڑی میں بند ہے۔ باپ، بیٹا اور خاوند، کپڑے، زیور اور ان کے اوپر خوف کی گانٹھیں لگی ہوئی ہیں۔ میں کیا لکھوں۔ آپ ہی بتلائیے؟ اُس سے تو کوئی انٹرویو ہو ہی نہیں سکتا۔"

میں نے اس کی پریشانی دیکھ کر صرف اتنا کہا۔

"اب انٹرویو کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی۔ تمہیں اب اس سے کچھ نہیں پوچھنا۔ اگر یہ بتلا سکتے ہو کہ ان گٹھڑیوں کے اندر کیا بند ہے تو یہی کافی ہے۔"

وہ میرا منہ تکنے لگا اور مایوسی کے عالم میں اپنا آخری سگریٹ بجھا کر کیفے ٹیریا سے باہر نکل گیا۔

چکّر اِک تقدیر کا

یہ تقدیر کا چکّر تھا یا کیا کہ میں نے ایک روز اپنے آپ کو اُس ملک میں پایا۔
میرے قدم جونہی اُس سرزمین سے چھوئے، تو ایسا لگا کہ یہ سرزمین تو میرے بزرگوں کی تھی اور میں اِس ملک میں اجنبی ہرگز نہیں ہوں۔ دوسرے ملکوں میں جہاں کہیں بھی گیا، تو میرے پاؤں ان کی زمین سے نہیں لگتے تھے۔ میں قدم رکھتا تھا، تو یوں لگتا جیسے ہوا میں چل رہا ہوں۔ زمین میرے پاؤں کو پکڑتی ہی نہیں تھی۔ مگر اس ملک میں یوں لگا کہ یہاں کی زمین نے میرے پاؤں کو پہچان لیا ہے اور جب میں اس پہ قدم رکھتا ہوں، تو وہ میرے پاؤں کو پکڑ لیتی ہے اور دوسرا قدم اٹھانے کے لئے مجھے زور لگانا پڑتا ہے۔

زمین کا قصہ یہ ہے کہ حکومتیں اور راجدھانیاں تو بدل جاتی ہیں مگر وہ وہیں پہ قائم رہتی ہے جو اس میں سما چکے ہیں، ان کا حساب رکھتی ہے اور آنے والوں کو اپنی خوشبو سے اُن کی خبر دیتی ہے، مجھے اس مٹی میں قدم قدم پر اپنے بزرگوں کے قدموں کے نقش دکھائی دیئے۔ عمارتوں میں لگی ہوئی ایک ایک اینٹ ان کی گواہی دے رہی

تھی، جو ان حویلیوں میں زندگی گزار گئے تھے، نقش و نگار سے سجی ہوئی خوبصورت مسجدوں کے مینار ان نسلوں کے گواہ تھے، جنہوں نے ان کے سائے میں سجدے گزارے تھے، گلی کوچے، مکانات، باغات، درگاہیں سب کی سب اس تہذیب کی شہادت دے رہی تھیں، جو کبھی زندہ تھی، مگر اب ان مسجدوں، بازاروں، باغوں اور گلی کوچوں میں ایک ویرانی اور اُداسی تھی، جو مجھے قدم قدم پہ یاد دلاتی تھی کہ یہ شہر تو تیرا شہر اتھا۔ اس کی تہذیب تیرے بڑے بوڑھوں نے سینچی اور شہر کی ایک ایک اینٹ پر اپنے نقش ثبت کیے، تو اِسے چھوڑ کے کہاں چلا گیا؟

اس زمین نے میرے پاؤں کو پہچان لیا تھا، مجھے پہچان لیا تھا۔ میں غیر ہوتے ہوئے بھی اس زمین کے لیے غیر نہ تھا۔ میری پہچان مجھ سے پہلے وہاں موجود تھی۔ میری وہاں موجودگی دراصل اُس چکّر کی تکمیل تھی، جس کا نام زندگی ہے۔ زندگی سیدھی لائن میں سفر نہیں کرتی، یہ دائرے کی شکل میں آگے بڑھتی اور دائرے ہمارے اوپر نیچے زمین اور آسمان کی صورت میں ہیں کہ جو چکّی کے دو پاٹوں کی طرح چل رہے ہیں۔ زندگی کی رفتار اور سمت انہیں دائروں سے متعیّن ہوتی ہے۔

یہ پاؤں کا چکّر تھا یا تقدیر کا کہ میں اس شہر کے گلی کوچوں میں حیران و سرگرداں پھرتا رہتا۔ در و دیوار میں گئے ہوؤں کو تلاش کرتا اور جو آوازیں اور خوشبوئیں چاروں طرف پھیلی ہوئی تھیں، ان میں اپنے بچپن کو ڈھونڈتا۔ میرا بچپن انہی خوشبوؤں اور آوازوں میں گزرا تھا۔ اب جب وہ لوٹ کے آئیں، تو میرا بچپن بھی ساتھ ہی میں لوٹ آیا۔ کیا ایسا تو نہیں کہ میں جہاں سے چلا تھا، پھر وہیں آ گیا ہوں اور زندگی کا چکّر اپنے اختتام کو پہنچ رہا ہے؟ لیکن درمیان میں وہ جو ایک نئی زندگی شروع ہو گئی تھی، اُس کا رُخ تو ادھر کا نہیں، اُس کا رُخ اور سمتیں تو اب بدل گئی ہیں۔ تو پھر میں کہاں ہوں؟ کہاں سے چلا تھا اور کدھر پہنچ گیا ہوں۔ بچپن میں کچھ خواب دیکھے تھے،

اُن خوابوں کا کیا ہوا؟ وہ کہاں چلے گئے؟

دماغ میں ایک زبردست کنفیوژن پیدا ہوگیا تھا۔ میں تقدیر و تدبیر کے چکر میں زیادہ نہیں پڑتا۔ اسے صرف پیدائش، موت اور شادی تک ہی محدود رکھتا ہوں کہ تینوں کام تدبیر سے نہیں، تقدیر سے ہی طے ہوتے ہیں۔ باقی زندگی محنت و کوشش ہی سے سنورتی اور رُخ بدلتی ہے لیکن جس معاشرے میں میں اب اپنے آپ کو پا رہا تھا، وہ تو تقدیر پرستی کے جال میں ایسا پھنسا ہوا تھا کہ اُٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے ہر بات میں ستاروں کا اثر دیکھ کر قدم اُٹھایا جاتا۔ شام ڈھلتے ہی آسمان پر اگر صرف ایک ستارہ نظر آگیا، تو فوراً تلاش ہوتی کہ دوسرا بھی دکھائی دے۔ ایک ستارے کا دیکھنا منحوس تھا۔ دوسرا ستارہ نظر نہیں آیا تو لوگ واپس گھر کو مڑ جاتے تھے۔ راہ چلتے ہوئے بلی نے راستہ کاٹ لیا، تو وہیں سے قدم واپس موڑ لئے کہ اب اس راستے سے آگے جانا منحوس ہے۔ بَر ڈھونڈنے کے لئے لڑکے اور لڑکی کے ورش فال یعنی زائچے تیار کر کے ان کا موازنہ کیا جاتا تھا کہ ستاروں کی رُو سے دونوں کی زندگی اچھی گزرے گی یا نہیں؟ اگر وہ آپس میں میل نہیں کھاتے تو شادی نہیں ہو سکتی۔ کوئی کام رُک گیا ہے تو جوتشی سے پوچھا جا رہا ہے۔ خاوند روٹھ گیا ہے، تو جوتشی جی عُقدہ حل کر رہے ہیں، عشق ہو گیا ہے، تو جوتشی کامیابی و نامرادی کی بشارت دے رہا ہے۔

ہاتھ دیکھ کر قسمت کا حال بتانے والے بھی تھے اور کچھ ایسے بھی تھے، جو چہرہ دیکھ کر ماضی، حال اور مستقبل کا آئینہ بیٹھے بیٹھے دکھا دیتے تھے۔ میں نے جو اپنی زندگی کے چند ادھورے خواب لئے کنفیوژن کی حالت میں تھا سوچا کہ ہاتھ کی لکیروں کو تو میں بدل نہیں سکتا، البتہ یہ چہرہ بچپنے اور جوانی کے بعد کئی روپ بدل چکا ہے۔ اس بدلے ہوئے چہرے میں اپنی تلاش کیوں نہ کی جائے؟ کیوں نہ اس سے ذرا پوچھا جائے کہ کیا بیت چکی ہے اور آگے کیا بیتنے والی ہے؟

پتا چلا کہ چہرہ شناسی کا ایک ماہر، پنڈت چوہان، جامع مسجد کے پچھواڑے ایک گلی میں رہتا ہے، لوگ جوق در جوق اُن کے پاس جاتے ہیں، وہ چہرہ دیکھتا ہے اور بولنا شروع کر دیتا ہے۔

چنانچہ پنڈت چوہان کی تلاش میں دلّی شہر کی تنگ گلیوں میں گھومتا گھامتا بالآخر پنڈت چوہان کی بیٹھک میں جا پہنچا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک گرانڈیل مرد سفید گھنی مونچھوں کے ساتھ فرش پہ لیٹا ہوا ہے۔ مونچھیں ڈھلک کر ٹھوڑی کے دونوں کناروں کے نیچے لٹک رہی ہیں۔ سر منڈا ہوا ــ اور آنکھیں موٹی موٹی۔ روشن اور سُرخ بنیان کے نیچے سفید دھوتی پہنے پنڈت چوہان ایک عورت سے محوِ گفتگو تھا۔ میری صورت دیکھی، تو فوراً اشارے سے روکا اور گرجدار آواز کے ساتھ حکم دیا کہ باہر انتظار کرو۔

وہ عورت جب چلی گئی، تو وہی گونجدار آواز آئی۔ "اندر آ جاؤ۔"

میں اندر کمرے میں داخل ہوا۔ حکم ہوا "جوتے اُتار کے سامنے بیٹھ جاؤ۔"

میں آلتی پالتی مار کے پنڈت جی کے سامنے بیٹھ گیا۔

حکم ہوا "دائیاں ہاتھ نکالو۔"

دائیاں ہاتھ آگے بڑھایا، تو پنڈت جی نے اُسے ایک فُٹے سے ناپا۔ پہلے چوڑائی میں، پھر لمبائی میں۔ پھر پوچھا "تاریخ پیدائش یاد ہے؟" کہا: "جی ہاں ۱۵ مئی ہے۔

پھر پوچھا "گھڑی کونسی تھی؟ اب ہمارے یہاں تو ایسا کوئی اہتمام نہیں کیا جاتا کہ تاریخِ پیدائش اور گھڑیاں بھی لکھی جائیں۔ میری ماں ایک کاغذ پہ اپنے ہاں جنم لینے والے ہر بچے کی تاریخِ پیدائش لکھ دیتی تھی اور یہ کاغذ میرے باپ کے ایک رجسٹر میں پڑا ہوا کہیں ملا تھا، جس سے مجھے اس تاریخ کا علم ہوا تھا مگر گھڑی کا تو کوئی ذکر اس کاغذ پہ نہ تھا۔

میں نے کہا "پنڈت جی، سمے کا تو کچھ کہہ نہیں سکتا۔ میری ماں اتنا کہا کرتی تھی کہ جب صبح کی روشنی ابھی پھوٹنے لگی تھی تو تم اس دنیا میں آئے تھے۔"

پنڈت چوہان نے خشمگیں نظروں سے میری طرف دیکھا اور ایک کاپی نکال کر اس میں کچھ جمع تفریق کرنے لگا۔ پھر پنسل کو کاپی پہ زور سے پھینک کے اپنی موٹی موٹی آنکھیں میرے چہرے کی طرف موڑ دیں اور ایک ٹکٹکی باندھ کر مجھ پہ نظریں گاڑ دیں۔ ایک عجیب شدت سی اس کی نظروں میں تھی، جو مجھ پر دباؤ ڈالے ہوئے تھیں اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ ان نظروں کے بوجھ تلے میں پچھلی دیوار کے ساتھ لگ جاؤں گا۔ میرا دم گھٹنے لگا مگر جلد ہی پنڈت جی نے بولنا شروع کر دیا۔ پنڈت چوہان کا لہجہ بڑا کرخت تھا اور گفتگو میں اکھڑ پن۔ وہ اپنے گاہکوں کو "تو" کہہ کے بلاتا تھا اور ہر جملہ بولنے کے بعد پوچھتا تھا "کہو کیسا ہے؟" مطلب یہ کہ جو بات تمہارے بارے میں اُس نے اپنے علم سے کام لے کر بتلائی ہے، وہ درست ہے یا نہیں۔ پنڈت چوہان نے اب جو بولنا شروع کیا، تو وہ ہوا کے گھوڑے پہ سوار تھا۔ نہ کاما، نہ فل شاپ۔ اس تیز رفتاری سے بولے چلا جا رہا تھا کہ میں "کہو کیسا ہے" کا جواب بھی ابھی دے نہ پاتا تھا کہ دوسرا جملہ کھٹ سے گرتا اور پھر وہی سوال "کہو، کیسا ہے؟" پنڈت چوہان کی گاڑی اب نہایت تیزی سے دوڑے چلی جا رہی تھی۔

"دو بیٹے ہونا چاہئیں۔ کہو کیسا ہے؟"

"جی ہاں۔"

"ایک لمبائی میں جا رہا ہے۔ ایک چوڑائی میں۔ کہو کیسا ہے؟"

"جی ہاں۔ بڑے والا لمبا ہے اور چھوٹے والا موٹا۔"

پنڈت نے میرا جملہ سُنے بغیر اپنا جملہ لُڑھکا دیا۔

"بڑے والے کے اُوپر والے جبڑے کا علاج شروع کیا تھا۔ درمیان میں چھوڑ دیا؟"

"کہو، کیسا ہے؟"

"جی ہاں"۔ میرے بڑے بیٹے کے اُوپر والے سامنے کے دانت ذرا باہر کو نکلے ہوئے تھے اور اس کا علاج میں نے جرمنی کے قیام کے دوران شروع کروایا تھا کہ درمیان میں میرا تبادلہ وہاں سے ہوگیا اور علاج مکمل نہ ہوسکا۔

"بچپن میں تین دفعہ ٹائی فائیڈ ہوا۔ کہو کیسا ہے؟"

"جی ہاں"

"اِس سے نظر کمزور ہوگئی اور سکول ہی میں عینک لگ گئی کہو کیسا ہے؟"

"جی ہاں"

"گُردے میں پتھری ہوگئی تھی۔ اپریشن سے نکلوا دی۔ کہو کیسا ہے؟"

"جی ہاں"

"دایاں گردہ دکھائی دے رہا ہے۔ کہو کیسا ہے؟"

"جی ہاں"۔ میرے دائیں گردے کا اپریشن ۱۹۶۷ء میں ہوا تھا۔"

"معدے کے السر کی شکایت رہی۔ سات برس۔ کہو کیسا ہے؟"

"جی ہاں۔ بالکل"

"روزانہ کچّا کیلا کھایا کرو۔"

"معدے کا درد بھی شدید رہا ہے۔ کہو کیسا ہے؟"

"جی ہاں"

"بیسنی روٹی کھایا کرو۔"

"بیوی بڑی وجیہہ صورت اور رُعب دار ہے۔ مگر دائیں سائیڈ کمزور نظر

آرہی ہے۔"

"جی ہاں" اُسے بچپن میں پولیو ہوگیا تھا، جس سے دائیں ٹانگ مفلوج ہوگئی تھی"

"بڑی ہوشیار ہے۔ تم پیر بھی ہلاتے ہو، تو اُسے پتا چل جاتا ہے۔"

"جی ہاں"۔ یہ کہتے ہوئے مجھے اپنے حال پہ ذرا سا رحم آیا اور میں نے اپنے پاؤں کی طرف دیکھا، جو اُس وقت بالکل ساکت ہو گیا تھا۔

اس سوال کے جواب میں ابھی ہاں اور نہ کہ مخمصے ہی میں تھا کہ پنڈت چوہان کا اگلا جملہ آن گرا۔

"اپنے ملک سے سات برس سے باہر ہو۔ کہو کیسا ہے؟"

"جی ہاں"

"ابھی اور باہر رہو گے۔"

میں اس جملے پر خاموش رہا۔

"ایک عینک والا شخص تمہارے پیچھے پڑا ہوا ہے، اس کے ہونٹ ذرا باہر کو لٹکے ہوتے ہیں۔"

میں نے سوچا کہ یہ حلیہ تو میرے سفیر کا ہے، جو میری صورت دیکھتے ہی بیزار ہو گیا تھا اور اُس کے ہونٹ اور باہر کو لٹک گئے تھے۔ اس بیزاری میں اس نے کوئی کمی واقع نہ ہونے دی تا آنکہ میں اس سے بیزار ہو کر ہونٹ لٹکائے واپس نہ آ گیا۔

"اس سے خبردار رہنا۔ تمہاری بیڑیوں میں وٹے ڈال رہا ہے۔"

میری بیڑی میں اس نے واقعی بہت وٹے ڈالے اور قریب تھا کہ میں ڈوب جاتا کہ میں وہاں سے بھاگ نکلا۔ میری بیڑی آج بھی اُس کے ڈالے ہوئے وٹوں سے لبالب بھری ہوئی ہے اور میری کشتی اس وقت سے ایسی ڈانواں ڈول ہے کہ اگر تائید ایزدی مجھے حاصل نہ ہوتی، تو یہ کب کی ڈوب چکی ہوتی۔

مَیں پنڈت چوہان کے اس جملے پر بھی خاموش رہا کہ اُس نے مجھے میری زندگی کا ایک اور عکس دکھا دیا تھا۔

پنڈت بولے چلا جا رہا تھا۔

"جب بھارت دیش کی بانٹ ہو رہی تھی، تو تمہاری پیٹھ پر پولیس نے ایک ڈنڈا مارا تھا۔ کہو کیسا ہے؟"

یہ بھی بالکل سچ تھا۔ جب ملک تقسیم ہو رہا تھا، تو میں نانویں جماعت میں پڑھتا تھا اور مسلم لیگ کے ایک جلوس میں جو خضر حیات کی وزارت کو توڑنے کا مطالبہ کر رہا تھا اس میں شریک تھا اور "خضر وزارت مردہ باد" اور "پاکستان زندہ باد" کے نعرے لگا رہا تھا کہ اچانک پولیس کے ایک سپاہی نے آگے بڑھ کر ایک ڈنڈا اس زور سے میری پیٹھ پر مارا کہ میرا جسم درد سے چیخ اُٹھا اور میرا گوشت اس حصے پہ اُبھر آیا اور ایک نیلا سُرخ نشان پیٹھ پر ثبت ہو گیا۔ میری ماں کئی روز اُس پر سرسوں کا تیل گرم کر کے مالش کرتی رہی اور ایسا کرتے وقت اُس پولیس والے کو ڈھیروں بددعائیں دیتی کہ اس کے سب بچوں کی پیٹھوں پر اللہ کرے ایسے ہی نیلے نشان لگ جائیں اور کبھی نہ مٹیں۔ مگر اس نشان کو میں نے بہت سنبھال کے رکھا اور میرا جی چاہتا تھا کہ بس یہ درد ختم ہو جائے مگر یہ نشان باقی رہ جائے۔ مَیں اسے پاکستان کی مُہر سمجھتا تھا، جو اللہ نے میری پشت پر لگا دی تھی۔ یہ میری زندگی کی سب سے قیمتی متاع تھی۔

پنڈت چوہان اُس کے بعد خاموش ہو گیا۔ اِس اچانک خاموشی سے مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ اب تک اُس نے جو کچھ بتلایا تھا، وہ میرے ماضی سے متعلق تھا یا حال سے مگر آگے کا حال اُس نے ذرا نہ بتلایا تھا۔ چنانچہ اب مَیں نے پنڈت جی سے مستقبل کے بارے میں سوال پوچھنے شروع کر دیئے مگر ان تمام سوالوں کے جوابات میں وہ قطعیت

اور اعتماد نہ تھا جو پنڈت جی نے ماضی اور حال کے بارے میں بیان
کیا تھا۔ میں نے دھن دولت، صحت، ملازمت، بیوی اور اولاد
کے بارے میں جتنے بھی سوالات کئے ان کا جواب گول مول سا تھا کہ میرے پلّے
کچھ نہ پڑتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ماضی کے بارے میں جو کچھ پنڈت جی نے
کہا تھا، ان کی ایک ایک بات میری زندگی کی واردات تھی مگر مستقبل کے بارے
میں پنڈت جی کا علم بالکل خاموش ہوگیا تھا۔ میں نے اُن کی کہی ہوئی رقم اُن کے
ہاتھ پہ رکھی اور باہر نکل آیا۔ بہت سے لوگوں کو جو پنڈت چوہان کو جانتے تھے۔ ان
سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا اور پوچھا کہ ماضی کا بیان تو حرف بہ حرف درست تھا مگر
مستقبل کے بارے میں پنڈت جی کے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا۔ اس پر پنڈت جی کے
جاننے والوں نے ایک ہی بات کہی کہ پنڈت جی کو پرماتما نے کوئی شکتی (طاقت) عطا
کر رکھی ہے کہ چہرہ پڑھ کر بولنے لگ جاتے ہیں، پہلے پہلے ماضی، حال اور مستقبل تینوں
کی کیفیت بیان کیا کرتے تھے مگر پھر جب دھن دولت کا لالچ ہو گیا، تو مستقبل کا
حال بیان کرنے کی قوت ان سے چھن گئی۔ اب ماضی اور حال سے آگے نہیں دیکھ سکتے۔
پنڈت جی کے علم کا ایک حصّہ مفلوج ہوگیا ہے۔

اس ملاقات کے چند ہی ہفتے بعد ایک چھٹی کے روز میں اپنے گھر کے باہر والے
لان میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا کہ ایک کار میرے گھر کے سامنے آن کے رُکی۔ اس
میں سفید کُرتے اور دھوتی میں ایک صاحب اُترے۔ اُن کے اُترتے ہی تین نوجوان
جو انہی کی طرح سفید کُرتوں اور دھوتیوں میں ملبوس تھے کار کی پچھلی سیٹوں سے
برآمد ہوئے۔ ان میں سے ایک نے بھاگ کر ایک چھتری کھولی اور جو صاحب
سب سے پہلے اُترے تھے۔ اُن کے سر پر تان دی اور دوسرے ان کے پیچھے
آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ سب نے ماتھوں پر قشقہ کھینچا ہوا تھا اور جو صاحب چھتری

کے نیچے بڑے پُرعظمت انداز میں قدم اُٹھا رہے تھے، وہ گورو قسم کی شے تھے۔ وہ میرے دروازے کے سامنے کھڑے ہو گئے تو مَیں چونکا۔ "یا اللہ یہ جلوس میرے دروازے پہ آن کے کیوں کھڑا ہو گیا ہے۔ میں تو انہیں جانتا بھی نہیں۔" اتنے میں گورو قسم کے بزرگ نے پھاٹک کے پاس کھڑے کھڑے ہی پوچھا۔

"آپ مُنیر صاحب ہیں؟"

میں نے عرض کیا۔ "جی ہاں۔ مجھے منیر کہتے ہیں۔"

کہنے لگے: اندر آ سکتا ہوں؟ میں نے کہا "بصد شوق۔"

اس پر وہ سبھی اندر آ گئے۔ میں نے ڈرائینگ روم میں اُنہیں بٹھایا۔ گورو جی کہنے لگے۔ مجھے پنڈت پربھاکر کہتے ہیں۔ میں گوجرانوالہ کا رہنے والا ہوں۔ ان دنوں سہارنپور میں نجوم کے کالج کا پرنسپل ہوں۔ مجھے پتا چلا کہ گوجرانوالہ سے ایک صاحب سفارتخانے میں آئے ہوئے ہیں، تو ملنے آ گیا۔ مجھ سے یہ سُن کے رہا نہیں گیا کہ میرے شہر سے ایک شخص آیا ہے، تو میں اُسے نہ ملوں۔ آپ مجھے نہیں پہچانیں گے۔ میں بٹوارے کے وقت چودہ پندرہ برس کا تھا۔ بٹوارہ ہو گیا، تو اِدھر چلے آئے۔ میرے والد گوجرانوالہ میں علم نجوم کے بڑے ماہر تھے اور بڑے مشہور آدمی تھے۔

میں فوراً بول اُٹھا۔ "آپ پنڈت گوری شنکر کا ذکر تو نہیں کر رہے جو بھٹروں والے بازار میں بیٹھتے تھے۔"

"بالکل۔ بالکل۔ آپ نے بالکل صحیح پہچان لیا۔ وہ میرے والد تھے۔ گوجرانوالہ میں دُور دُور سے لوگ اُن کی سیوا میں حاضر ہوتے تھے۔ ستارہ شناسی کے بڑے عالم تھے۔ میں نے انہی سے یہ علم ورثے میں پایا اور اب آگے اس کا دان کر رہا ہوں۔ علم کے دان سے علم بڑھتا ہے۔ میں ان دنوں سوامی رام تیرتھ پہ ریسرچ کر رہا ہوں۔ ڈاکٹر اقبال نے بانگِ درا میں اُن پہ ایک نظم بھی کہہ رکھی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نظر والوں کو پہچانتے تھے

اور متعصب نہیں تھے۔ انہوں نے رام کرشن، مہاتما بدھ اور گورونانک سب پہ نظمیں لکھیں۔ وہ بڑے آدمی تھے۔ ہم میں اب اتنے بڑے آدمی پیدا نہیں ہوتے، جو مذہب اور فرقہ پرستی سے بلند ہو کر سوچتے ہوں۔ آپ میرا مطلب سمجھ گئے ہیں ناں، تو یہ سوامی رام تیرتھ بھی گوجرانوالہ ہی کے تھے۔ ابھی ریسرچ کے سلسلے میں مجھے گوجرانوالہ جانا ہے تاکہ وہاں ان کے گھر اور سکول کی تصویریں لے سکوں اور جو بھی ان کے متعلق کوئی کتاب یا پرچہ ملے اُسے اکٹھا کروں۔ اس بہانے اپنی جنم بھومی بھی دیکھ لوں گا۔ ہمارا گھر تو آپ کو پتا ہے، پتھر والے بازار کے ساتھ والی گلی میں تھا۔ جو سیالکوٹی دروازے کی طرف پرکاش ٹاکیز کے سامنے جا نکلتی تھی۔ آپ ذرا ویزا دلوانے میں میری مدد ضرور کیجئے گا۔ پنڈت پربھاکر مجھ سے بے پناہ محبت کا اظہار کر رہے تھے اور ان کی آنکھوں میں آنسو بھی تیرنے لگے تھے۔ وہ بار بار کہتے: آپ سے مجھے اپنی مٹی کی باس آتی ہے۔ آپ میرے بھائی ہیں، میرے دوست، میرے وطن کے ہیں۔

میں نے پوچھا: آپ کیا پئیں گے؟ ٹھنڈا یا گرم؟"

اس پر پنڈت جی کے ایک چیلے نے کہا:

"مہاراج ایسے گھر کے برتنوں میں کھاتے پیتے نہیں ہیں جہاں ماس کھایا جاتا ہو۔"

اس جواب پر میں کٹ سا گیا۔ پنڈت جی میری میزبانی کو اس لئے قبول نہیں فرما سکتے تھے کہ میں ماس کھانے والوں میں سے ہوں اور میرے برتن ناپاک ہیں، تو اگر میرے برتنوں سے انہیں نفرت ہے، تو میں جو ماس کھا کھا کے ہی پلا بڑھا ہوں، مجھ سے محبت کیسے کریں گے؟ مجھے چھونے پر اُنہیں گھن نہیں آئے گی؟ مجھے تو یہ گلے بھی نہیں لگا سکیں گے؟ بہرحال میں نے انہیں کہا کہ میں اپنے بھائی کو لکھوں گا کہ وہ آپ کے گھر کا ذرا پتا کریں کہ وہ ابھی وہاں موجود بھی ہے یا نہیں۔

چنانچہ میں نے بڑے بھائی کو خط لکھا کہ پنڈت گوری شنکر کے گھر کا معلوم کریں کہ اُس کی کیا کیفیت ہے۔ پنڈت گوری شنکر کا بیٹا آنا چاہتا ہے اور اپنے گھر کو دیکھنا چاہتا ہے۔

بڑے بھائی کا جواب آیا۔ پنڈت گوری شنکر کے بیٹے کو آنے سے روک دو، اُس نے اگر اپنا گھر دیکھ لیا، تو وہیں کھڑے کھڑے دم توڑ دے گا۔ ان کے گھر پر رہتک اور کرنال کے وُڈ قصائیوں کا قبضہ ہے اور انہوں نے اسے پنڈت جی کی گئو ماتا کا مذبح بنا ڈالا ہے وہ اس منظر کی تاب نہیں لا سکیں گے۔ لہٰذا تم سوچ لو کہ انہیں کیسے باز رکھنا ہے۔

چند روز بعد پنڈت پربھاکر پھر تشریف لائے۔ میں نے انہیں کہا کہ ویزے کی ابھی دقت ہے۔ کوشش کر رہا ہوں۔ جب بھی کامیابی ہوگی آپ کو بتلا دوں گا۔ پنڈت پربھاکر گوجرانوالہ کی بہت سی باتیں کرتے رہے۔ اسی گپ شپ کے دوران انہوں نے مجھ میں دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا: کیا خیال ہے کہ ذرا آپ کا حساب کتاب نہ کر لیا جائے"

میں نے فوراً جواب دیا" ضرور۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں"

اس پر انہوں نے میری پیدائش کی تاریخ اور گھڑی پوچھی۔ میرا جواب وہی تھا۔ جو میں نے پنڈت چوہان کو دیا تھا۔

پنڈت پربھاکر نے کچھ دیر خاموشی اختیار کی۔ پھر ایک کاغذ کی چٹ پر کچھ لکھا اور اُسے تہ کر کے اپنے پاس ہی بیٹھی ہوئی میری بیوی کو تھما دی۔ پھر میری طرف مخاطب ہوئے اور بولے۔

"اِس سمے آپ کے دماغ میں جس چیز کا خیال آتا ہے اُسے کاغذ پر لکھ دیں"

میں پنڈت جی کے مقابل سامنے والی دیوار کے ساتھ لگے ہوئے صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے کاغذ پہ "گلاب" کا لفظ لکھ دیا۔

"پنڈت جی نے پوچھا۔ لکھ دیا ہے آپ نے ؟"

"میں نے کہا۔ جی حضور۔ لکھ دیا ہے۔

"انہوں نے کہا پڑھ دیجئے کیا لکھا ہے؟"

میں نے کہا "گلاب"

پنڈت پربھاکر نے میری بیوی کو اشارے سے کہا: "ذرا کھولیئے اپنا کاغذ اور پڑھیے کیا لکھا ہے اس میں؟

میری بیوی نے جھٹ کی تہیں کھولیں اور کہا "گلاب"

ہم حیرت میں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگ گئے۔ پنڈت پربھاکر نے ہمیں حیرت زدہ دیکھ کر کہا: یہ صرف ایسڈ ٹیسٹ (ACID TEST) ہوتا ہے۔ اگر یہ الفاظ اِس وقت نہ ملتے تو میں آپ کا حال نہ بتلاتا۔ اب یہ مل گئے ہیں، اس کا مطلب ہے کہ آپ کی پیدائش کی گھڑی بھی درست ہے اور میرا زائچہ بھی اب درست ہوگا۔

پھر پنڈت پربھاکر نے کاغذ پر ایک مربع بنا کر اس کے مختلف خانوں میں ستارے بٹھائے اور تھوڑی دیر کے بعد کہا کہ آپ کی کنڈلی تیار ہے۔ اب پوچھئے کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔ آپ پوچھیں گے یا میں بتلاتا جاؤں۔ میں نے کہا بتلائیے نہیں کاغذ پہ لکھ دیجئے۔

پنڈت پربھاکر کافی دیر کاغذ پہ لکھتے رہے اور پھر دو صفحے سیاہ کر کے میرے ہاتھ میں تھما دیے۔ میں نے جو پڑھا، تو اس میں ماضی کا ذکر تھا۔ نہ حال کا صرف مستقبل کی باتیں تھیں۔ یہ سال کیسا گزرے گا؟ اگلے سال میں کیا کیا ہوگا۔ اس سے اگلے دس سالوں میں کیا ہوگا؟ سن ۲۰۰۰ عیسوی تک کا حال انہوں نے اس میں درج کر دیا اور کہا کہ ہر سال کی تفصیل چاہتے ہیں، تو سال کے سال کنڈلی سے تفصیلی زائچہ بنا دیا کروں گا۔ اس کنڈلی کو سنبھال کے رکھئے گا۔

آنے والے وقت کے بارے میں اس سال کے لئے انہوں نے کہا کہ اگلے سال کے مارچ یا اپریل میں یہاں سے مجھے کوچ کرنا ہوگا۔ بالکل ایسے ہی ہوا۔ اگلے سال

میرا تبادلہ ہوگیا اور مَیں نے تیرہ مارچ کو دلّی چھوڑ دی۔ یہ سن ۱۹۸۲ء کی بات ہے۔
سن ۸۴ء کے زائچے میں لکھا کہ اکتوبر نومبر میں ایک بڑا آپریشن ہوگا، جو فائدہ مند ہوگا
اور اس سے صحت ملے گی۔ ۸ر اکتوبر ۸۴ء کو میرے قلب کی جرّاحی ہوئی اور وسط نومبر
میں صحت یاب ہو کے گھر لوٹا۔ دھن دولت کے بارے میں لکھا کہ مایہ جتنی ہاتھ میں
آئے گی، اتنی ہی خرچ ہو جائے گی۔ کچھ جمع نہ کر پاؤ گے۔ لیکن جب تلک زندہ رہو گے
کسی کے محتاج نہ ہوو گے۔" دھن دولت کے بارے میں بھی انہوں نے ٹھیک ہی کہا
تھا۔ چوبیس برس کی ملازمت کے بعد بھی اس میدان میں میں ابھی تک پیدل ہی
ہوں۔ پھر اور بہت سی باتیں روزگار اور گھریلو زندگی کے بارے میں کہیں۔

دونوں پنڈتوں نے مل کے میرے ذہنی انتشار میں اضافہ کر دیا تھا۔ چہرے کے
احوال اور ستاروں کی گردش میں میری پہچان میرے لئے اور بھی مشکل ہو گئی۔ میں نے
ماضی، حال اور مستقبل کو جوڑا اور اس میں دیکھنا چاہا کہ میرے ان خوابوں کا کیا ہوا، جو
میں نے بچپنے میں دیکھے تھے۔ پنڈت چوہان نے صرف ماضی کی باتیں کی تھیں اور مستقبل
کے بارے میں صرف ایک مبہم سا یہ جملہ اُس کے منہ سے لڑھک گیا تھا کہ "ابھی کچھ برس
اور باہر رہو گے۔" اور پنڈت پربھاکر نے صرف آنے والے زمانے کا حال بتلایا تھا اور
ایک بڑے اپریشن کا ذکر کیا تھا اور صحت کی نوید دی تھی مگر چونکہ وہ مُڑ کر ماضی
میں نہ دیکھتا تھا، اُس نے کہیں یہ پیش گوئی نہ کی کہ ملک کے بٹوارے کے وقت جو ڈنڈا
میری پیٹھ پر لگا تھا اور جسے میں اپنی زندگی کی بڑی قیمتی متاع سمجھتا تھا۔
تیس برس گزرنے کے بعد اُس کا درد جسم پر پھر جاگ اُٹھے
گا اور ناقابلِ برداشت ہو جائے گا۔ میں نے دونوں پنڈتوں کے مشاہدات کو جوڑا تو
یہی نکلا کہ میں جسمانی طور پر ملک میں واپس آجانے کے بعد بھی ابھی باہر ہی ہوں۔
افسوس کہ پنڈت چوہان سے میں اُس وقت ملا، جب مستقبل کے بارے میں کچھ کہنے کی

طاقت اس سے چھن گئی تھی اور یہ جملہ اُس نے ایسے ہی لُڑھکا دیا کہ کچھ برس اور ابھی باہر ہی رہو گے۔ کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے جیسے پنڈت چوہان کی شکتی تھوڑی دیر کے لئے اُسے واپس مل گئی تھی اور اُس نے میرے مستقبل کی جھلک دیکھ لی تھی اور وہ اس شخص کے کرب سے آگاہ تھا، جو جغرافیائی حدود کے اندر رہ رہا ہو ہو مگر وہاں موجود نہ ہو، اور پنڈت پربھاکر جو ماضی کے بارے میں کچھ نہ بتلاتا تھا، وہ میرے ان خوابوں کی نشان دہی نہ کر سکا، جنہیں بٹوارے کے وقت میں نے اپنے نئے ملک کے بارے میں دیکھنے کی کوشش کی تھی، تو اس پر ایک ڈنڈے کی شدید ضرب نے ان خوابوں کو بکھیر دینا چاہا تھا اور نہ ہی اس نے اس درد کا کوئی ذکر کیا، جو اَب اتنے برس بعد جاگ اُٹھا تھا۔ مگر جب خواب بکھرنے لگتے ہیں، تو سوئے ہوئے درد پھر سے جاگ اُٹھتے ہیں۔ وہ جو میری قیمتی متاع تھی اَب درد میں بدل گئی ہے اور پشت پر لگی ہوئی مہر دہکتے ہوئے پیسے کی طرح جسم کو جلانے لگی ہے۔

ہاں ایک بات تو میں بھول ہی گیا۔ پنڈت پربھاکر نے ایک جملہ آئندہ آنے والے برسوں کے بارے میں یہ لکھا تھا کہ روح کی بے چینی مستقل رہے گی۔ میں ہجرت کر گیا ہوں۔ مگر میرا جسم جو یہاں ہے درد سے کلبلاتا رہتا ہے۔ میری ماں تو میرے زخم پر سرسوں کے تیل کی مالش کرتی تھی اور میری صحت کی دعائیں مانگتی تھی۔ اب تو ماں بھی مر چکی ہے اور اس کی دعاؤں سے بھی محروم ہو گیا ہوں۔ میرے درد کا چکر اَب پورا ہونے لگا ہے۔

اوپریشن بائی پاس

دریائے ٹیمز کے کنارے، پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے دوسرے کنارے پر ہسپتال
کی سب سے اُوپر والی منزل کے ایک کمرے میں جب میری بے ہوشی ٹوٹی، تو میں نے
دیکھا کہ سرخ چہرے والا ایک شخص میرے لوہے کے پلنگ کے سرہانے کھڑا مسکرا
رہا تھا۔ جیسے اس نے موت کو فتح کر لیا ہو۔

اس نے پوچھا: "کیسا محسوس کر رہے ہو؟ میں تمہارا سرجن ہوں"
"ٹھیک ہوں" میں نے کہا "تم کون ہو؟"
"تمہارا سرجن۔ میں نے تمہارے دل کی جراحی کی ہے"
میں نے اُس کی طرف بڑی احسان بھری نظروں سے دیکھا کہ اُس نے مجھے
دوبارہ زندگی کی نوید دی۔
میں نے پوچھا: "آپ نے جب میرا سینہ کھولا، تو میرے دل کی کیا حالت تھی؟"
"تم پہاڑ کی چوٹی کے ایک کنارے پر کھڑے تھے۔ ایک قدم اِدھر یا اُدھر تمہیں
موت کی گہری وادیوں میں لے جاتا"

مجھے یہ سُن کر ذرا خوف محسوس نہ ہوا اس لئے کہ دل نے کبھی مجھے کوئی ایسی وارننگ نہ دی تھی جس سے میں اپنے آپ کو موت کے دہانے پر کھڑا پاتا۔ مگر میں واقعی موت کے دہانے پر کھڑا تھا، اِس کی مجھے کوئی خبر نہ تھی۔ پہاڑوں میں میرے لئے بڑی کشش ہے اور ان کی چوٹیوں پہ کھڑے ہو کر نیچے پُرسکون وادیوں کو دیکھتے رہنا بہت بڑی کمزوری ہے۔ یہ وادیاں موت ہی کی طرح پُرسکون اور خاموش ہوتی ہیں اور ان کے اُوپر ایک طلسم کی سی فضا ہوتی ہے، جو مجھے اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔ سرجن مجھے سانس لیتے ہوئے دیکھ کر بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔ اُسے ایسے لگ رہا تھا کہ اُس نے میرے مٹی کے بنے ہوئے جسم میں پھر سے روح پھونک دی ہے اور یہ جسم اب گرم ہو گیا ہے، اس کے اندر سانس کی دھونکنی پھر سے چلنے لگی ہے۔ آنکھوں میں روشنی لوٹ آئی ہے اور خشک ہونٹوں پہ نمی آ گئی ہے۔ یہ دنیا میں پھر لوٹ آیا ہے۔

اس آپریشن کے لئے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے جب امراضِ دل کے ماہر نے میرے دل کا حال معلوم کرنے کے لئے مجھے انجیو گرافی کے لئے ایک کشتی نما سٹریچر میں لٹا کر باندھ دیا، تو مجھے اپنے اس دنیا میں آنے پہ سخت وحشت ہوئی۔ بے شمار منتشر خیالوں میں ایک خیال یہ آتا کہ اس دنیا میں آنے کے لئے میں نے تو خدا کو کوئی درخواست نہ دی تھی اور اُس نے خود ہی مجھے بنا کر اس جہان میں بھیج دیا۔ پھر یہاں بھیج کر اس جسم کے عذاب سے میری روح کو بوجھل کیوں کر دیا؟ جسم میں بڑی لذتیں بھی چھپا رکھی ہیں۔ مگر یہی جسم جب بگڑ جائے تو پھر انسان کی بڑی توہین کرتا ہے۔ اپنی تمام لذتوں کا بدلہ لیتا ہے اور خود انسان اس کے عذاب سے پناہ مانگنے لگ جاتا ہے اور خدا ہی سے بار بار کہتا ہے کہ وہ اس کے حال پر رحم کرے اور اُسے اِس جسم کے عذاب سے نجات دلائے۔

موت تو پہلے ہی روز سے زندگی کے تعاقب میں لگ جاتی ہے اور جب تک اُسے اپنے پنجوں میں دبا کر اُس کا دم نہیں گھونٹ دیتی، تب تک آرام سے نہیں بیٹھتی۔ اُسے جاندار کی ہر سانس میں اپنی شکست کا احساس ہوتا ہے۔ وہ ہر سانس پہ جھپٹا مارتی ہے اور ہر شکست کے بعد اس کے غیظ و غضب میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ پھر یہ غصہ اور تلملاہٹ، اُس کے اعصاب پہ اس قدر بھاری ہونے لگتے ہیں کہ وہ شدید غضب میں آن کر ایک ایسا ہاتھ مارتی ہے کہ زندگی کو رگوں میں سے نچوڑ کر لے جاتی ہے۔

اِس کشتی نما سٹریچر میں کس کر مجھے فِٹ کر دیا گیا اور ایک کیمرہ میرے سینے کے اُوپر چلنے لگا۔ پھر ٹانگ اور نچلا دھڑ جہاں پہ آن کے ملتے ہیں، وہاں سے ایک نس کو کاٹ کر اُس میں ایک تار ڈال دی گئی اور اُسے آہستہ آہستہ اُوپر دل کی جانب دھکیلنا شروع کر دیا۔ میری نظروں کے سامنے ایک ٹی وی سیٹ لگا ہوا تھا۔ میں نے اُس میں دیکھا، تو سب سے پہلے اس میں مجھے ریڑھ کی ہڈی دکھائی دی۔

میں نے ڈاکٹر سے پوچھا یہ ہڈی کس کی ہے؟ اُس نے کہا: "یہ آپ ہی کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔" میں نے ریڑھ کی ہڈی کو دیکھا، تو مجھے کچھ عجیب سا لگا کہ مَیں ایک ایسی شے دیکھ رہا ہوں، جس پر میرا اوپر کا دھڑ کھڑا ہے —— پھر اس ہڈی کے پاس ہی گول گول سے دو گوشت کے ٹکڑے اپنے ہی گرد دائرے کی صورت میں گھوم رہے ہیں، اتنے میں ڈاکٹر کی آواز آئی۔ "آپ دیکھ رہے ہیں یہ آپ کے گُردے ہیں۔" ان کی حرکت دیکھ کر پہلی دفعہ مجھے یہ شدید احساس ہوا کہ میں تو ایک مشین ہوں اور میرے اندر تو گھڑی کے کل پُرزے لگے ہوئے ہیں۔ مشینوں کے بارے میں اقبال نے ان کی تحقیر، جو اپنی شاعری میں کر رکھی ہے، وہ تو ہمارے یہاں قریباً قریباً قومی نعرہ بن چکی ہے۔ یعنی انسان کی انسانیت کو کچل دینے والی ایجاد "احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات"

آلات کے خلاف یہ پروپیگنڈہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے ہمارے دانشور اپنے معاشرے کے زوال کے لئے مغرب کا نام لے دیتے ہیں کہ ہماری پستی کا باعث مغرب ہی ہے اور یوں مغرب اور مشینیں ہمارے شعور اور تحت الشعور میں نفرت کے سمبل بن گئے ہیں۔ گُردوں کو مشین کی طرح گھومتے ہوئے دیکھ کر کچھ ایسی ہی نفرت ہوئی۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ کیمرہ کھسک کر میرے سینے کے اُوپر آ گیا ہے اور ٹی وی کی ٹیوب پر گوشت کا ایک ٹکڑا سانس لے رہا ہے۔ کبھی پھیلتا ہے، کبھی سکڑ جاتا ہے۔ میں ابھی اُسے دیکھ ہی رہا تھا کہ ڈاکٹر کی آواز آئی "یہ دیکھ رہے ہیں سامنے۔ آپ کا دل دھڑک رہا ہے"۔ یہ آواز جب میرے کانوں سے ٹکرائی، تو میں نے نظریں سکرین سے ہٹا لیں۔ مجھے دل کو پھیلتے اور سکڑتے دیکھ کر وحشت سی ہونے لگی۔ گوشت کا ایک ٹکڑا پھر میری نظروں کے سامنے تھا اور ڈاکٹر کہہ رہا تھا: "آپ اپنے خاندان میں پہلے آدمی ہوں گے، جو اپنے دل اور گُردوں کو دیکھ رہے ہیں، آپ بڑے خوش قسمت انسان ہیں۔ آپ کے بزرگ اپنے جسم کے دل اور گردوں کی صورت سے ناواقف تھے"۔

"لیکن ڈاکٹر صاحب، میرا خیال ہے کہ میرے بزرگ اور بڑے بوڑھے خوش قسمت تھے کہ انہوں نے اپنے آپ کو دل، گُردے اور ہڈیوں کی شکل میں نہیں دیکھا، وہ اپنے آپ کو اشرف المخلوقات میں سے سمجھتے تھے، انہوں نے اپنا اینیمل (ANIMAL) نہیں دیکھا تھا۔ مجھے تو اپنے آپ کو گُردے، کپورے، کلیجی، پھیپھڑے اور دل کی شکل میں دیکھ کر اپنے آپ سے وحشت ہونے لگی ہے"۔

"نہیں۔ نہیں۔ اپنا باطن بھی دیکھنا چاہیئے"۔

باطن اب تک میرے لئے وہ تھا جو ظاہر نہ تھا۔ باطن کے لفظ کے ساتھ صوفیاً اور اولیاء کے بڑے بڑے فلسفے دماغ میں سامنے آنے تھے۔ باطن کو ظاہر پر فوقیت دی جاتی ہے۔ اسے نُور کا مسکن کہا گیا ہے۔ سچائی اور اصلیت کی پناہ گاہ بتلایا گیا

ہے۔ اس میں جھانک کر اپنے آپ کو تلاش کرنے کو کہا گیا ہے۔

میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب، ہٹائیے اس کیمرے کو۔ میرے باطن میں بس یہی کچھ ہے؟ ڈاکٹر ہنس پڑا۔

"آپ تو کوئی صوفی لگتے ہیں، کوئی فلسفی۔ اپنے دل کی طرف نگاہ دوڑائیے اور دیکھئے کہ جس کے پھیلنے اور سکڑنے سے آپ کی زندگی ضمانت ہے وہ کس طرح کا ہے؟

ڈاکٹر صاحب اِسے دیکھ کر مجھے وہی محسوس ہو رہا ہے، جو انسان کو چاند پر اُترتے دیکھ کر محسوس ہوا تھا"

"میں سمجھا نہیں" ڈاکٹر نے سوال کیا اور تار کو دل کے اُوپرے آیا جس کا منہ سانپ کی شکل کا تھا۔

"میرا مطلب ہے جس روز انسان نے چاند پہ قدم رکھا تھا اُس روز چاند کے ساتھ انسانی تخیّل نے جو حُسن اور جو متھ (MYTH) بُن رکھی تھی، وہ دھڑام سے زمین پر آن گری۔ صدیوں کا چاند اُس روز دم توڑ گیا تھا"

"تو اِس سے کیا نقصان ہوا؟ آپ پر چاند کی حقیقت آشکار ہو گئی"

"ڈاکٹر صاحب! مجھے تو یہ غم ہے کہ جب یہ دنیا بنی تھی اس چاند میں ایک بوڑھی مائی بیٹھی چرخہ کاتتی رہتی تھی۔ انسان کے وہاں قدم رکھتے ہی اُس لاکھوں برس کی بڑھیا کا انتقال ہو گیا۔

"آپ کی سوچ نہایت غیر سائنٹیفک ہے۔ آپ کو حقیقت کے دیکھنے کا حوصلہ اپنے اندر پیدا کرنا چاہیے"

"لیکن یہ "اندر" کیا ہے؟ آپ نے جو دکھلایا ہے، وہ تو محض ہڈیاں اور گوشت ہے، انسانی سوچ، فکر اور حُسن کو دیکھنے کی صلاحیتیں کونسے "اندر" میں ہوتی ہیں؟"

"آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی" ڈاکٹر تار کو اب دل کے چاروں طرف

گھما کے دیکھ رہا تھا۔

"کچھ نہیں ڈاکٹر۔ میرے ساتھ گڑبڑ یہ ہو گئی ہے کہ میں اپنے باطن کو اب باطن کی آنکھ سے نہیں دیکھ رہا، کیمرے کی آنکھ سے دیکھ رہا ہوں۔ کیمرہ تو وہی دکھلائے گا جو اسے دکھائی دے گا۔"

"تو یہ دیکھئے اب یہ تار آپ کے دل کی بیرونی سطح کے اُوپر آ گیا ہے۔ اب میں اس میں رنگ کا ایک مُرکب داخل کروں گا جو آپ کے دل کے اُوپر پھوار کی مانند گرے گا اور دل کی تمام رگیں اس سے روشن ہو جائیں گی۔ ہاں بس یہ خیال رکھیئے کہ جونہی یہ دوا دل پر گرے گی آپ کے جسم کے اندر آگ کا ایک شعلہ سا لپک جائے گا اور اس کی گرمی کو آپ اپنی رگ رگ میں محسوس کریں گے۔ بس گھبرائیے گا نہیں۔ گرمی کی یہ کیفیت ایک آدھ منٹ کے بعد خود ہی ختم ہو جائے گی۔

سکرین پر کیا دیکھتا ہوں کہ تار کے مُنہ سے ایک رنگدار پھوار سی خارج ہوئی بالکل ایسے جیسے پھنیئر سانپ منہ سے زہر پھینکتا ہے۔ میرے جسم کو جیسے کسی نے ماچس کی تیلی لگا دی ہو۔ وہ گرمی سے بھڑک اُٹھا اور میں ایک دم پسینے میں شرابور ہو گیا۔ یوں لگا کہ اب اس آگ ہی میں بھسم ہو جاؤں گا۔ سامنے سکرین پر دل پھیل اور سکڑ رہا تھا۔ یہی کیفیت مجھے اب جسم کی لگنے لگی۔ میں زور سے چلّایا" ڈاکٹر بس کرو۔" اس نے کہا" گھبرائیے نہیں۔ ابھی سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اور ایک منٹ بعد سب ٹھیک تو نہ ہوا البتہ کچھ کچھ ٹھیک ضرور ہو گیا۔ اب پھنیئر سانپ کے منہ سے رنگ گر رہا تھا اور کشتی نما سٹریچر کو لوہے کے ایک ہینڈل سے آہستہ آہستہ گھمایا جا رہا تھا۔ دائیں، بائیں اوپر نیچے اور اس کے اندر میں بھی ساتھ ساتھ اسی طرح گھوم رہا تھا، جیسے مشین میں چرغہ روسٹ ہو رہا ہے۔ ایک سیخ میں پھنسا ہوا وہ آہستہ آہستہ دائرے کی صورت میں اپنے ہی گرد گھومتا رہتا ہے۔

"یارب العالمین! تو اپنے بندے کو اپنے اس جہان میں بھیج کر اُس سے کیا سلوک کرتا ہے؟"

اس سٹریچر میں پھنس کر گھومتے ہوئے مجھے واقعی یہ لگ رہا تھا کہ میں آدمی سے مُرغا بن گیا ہوں۔

"ڈاکٹر! آپ نے تو میرا اچھا بھلا مُرغا بنا دیا ہے۔"

"ہاں۔ یہ بھی ضروری ہوتا ہے۔ آپ ہر وقت ہواؤں میں اُڑتے رہتے ہیں۔ مُرغا بننے سے اپنی حقیقت کا پتا چلتا رہتا ہے۔"

ڈاکٹر مجھے حقیقت دکھانے پہ تُلا ہوا تھا اور میں نے اپنے ارد گرد عظمت کے جو مینار تعمیر کر رکھے تھے وہ ایک ایک کر کے گرتے چلے جا رہے تھے۔ میں نے تنگ آ کر صرف یہ کہا:

"ڈاکٹر! تم حقیقت کے سوا اور کچھ نہیں دکھا سکتے۔ سب سے بڑی حقیقت تو موت ہے اور وہ بڑی گھناؤنی ہے۔ اس حقیقت تک پہنچتے پہنچتے درمیان میں یہ چھوٹی چھوٹی حقیقتیں دیکھ دیکھ کر زندگی کا سارا حُسن مجھ سے دور ہو گیا ہے۔ اس سے تو بہتر ہے کہ ایک مرتبہ سب سے بڑی حقیقت کو دیکھ لوں۔ زندگی کی عظمت اور اُس کے حُسن میں تو دراڑیں نہ آئیں گی۔" ڈاکٹر نے کہا "بس آپ نے جتنا مُرغا بننا تھا بن لیا۔ اب آپ بستر پر انسانوں کی طرح لیٹ جائیے اور آرام کیجئے۔"

اس سارے عمل کے بعد "انسان" کا لفظ سُن کر زور زور سے قہقہے لگانے کو جی چاہا مگر جسم میں اس قدر کمزوری واقع ہو گئی تھی کہ قہقہہ تو درکنار، مسکرانا بھی مشکل ہو گیا تھا۔

دو روز بعد ڈاکٹر نے بُلایا اور مجھے اینجیو گرافی کی فلم اپنے ساتھ بٹھا کر دکھائی اور کہا "مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ آپ کے دل کا آپریشن ضروری ہو گیا ہے۔ دل

کی دو بڑی رگوں میں سے ایک سکڑ کر مکمل بند ہو گئی ہے اور دوسری نوے فی صد آپ خطرے کے زون میں ہیں۔ بائی پاس سرجری کرنا ہو گی۔ یہ کہتے ہوئے اُس نے فلم میرے ہاتھ میں تھما دی۔

میں یہ خبر سنتے ہی بے حد نروس ہو گیا۔ میں جلدی سے اُٹھا اور باہر اپنی گاڑی کی طرف چلنے لگا۔ تو مجھ سے قدم اُٹھانا بھی مشکل ہو گیا۔ قدم اُٹھاتا تھا، تو وہ زمین پر نہ جمتا تھا۔ ڈانواں ڈول گرتا پڑتا دیواروں کا سہارا لے کر میں گاڑی کے دروازے تک پہنچا اور دروازہ کھولتے ہی دھڑام سے پچھلی سیٹ پر گر گیا۔ میرے ماتھے پر ٹھنڈے پسینے آ گئے۔ چہرہ زرد ہو گیا اور حواس مختل ہو گئے۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا، میں کہاں پڑا ہوں۔ جب ذرا ہوش آیا، تو بس ایک خیال بار بار ذہن میں آتا "ابھی تو بہت سے کام باقی تھے۔ یہ واپسی کچھ جلد ہی ہو گئی ہے" پھر خود ہی اس خیال پہ ہنس دیا کہ کام اس جہان میں کس کے پورے ہوئے ہیں؟ رہا معاملہ جلدی کا تو ایسے بھی کئی اس دنیا میں آئے کہ ادھر آئے اور ابھی پہلا سانس بھی نہ لیا تھا کہ واپس مڑ گئے۔ عجب تماشا ہے یہ دنیا تم بھی اس تماشے کا حصہ ہو۔ اِسے تماشا ہی سمجھو اور جس نے تمہیں بنایا ہے اس کا نام لو اور ریسٹ جاؤ، سینہ پھڑوانے کے لئے۔ تمہیں کیا پتا چلے گا تمہارے ساتھ کیا ہو رہا ہے، وہ جو کھول کے دیکھیں گے، انہیں بھی تو وہی نظر آئے گا جو میں سکرین پہ دیکھ چکا ہوں۔ وہی پُرزہ جات ہیں۔ زندہ رہنا چاہتے ہو، تو بھاگو نہیں۔ مقابلہ کرو۔ بھاگ جانے سے کبھی کچھ نہیں ملتا۔ کامیابی مقابلے ہی سے حاصل ہوتی ہے" لیکن کیا زندہ رہنا ضروری ہے؟ میں خطرے کے زون میں ہوں۔ زندگی کی چند روزہ مہلت اور کیوں مانگ رہا ہوں؟ کل بھی مرنا ہے۔ آج ہی مر گئے تو کونسی قیامت ڈھے جائے گی؟ کون سے کام بند ہو جائیں گے۔ اس جہان میں کوئی ناگزیر نہیں ہے۔"

"کیا زندگی اس قابل ہے کہ اس کے لیے اتنے بڑے امتحان میں سے گزرا جائے؟"

"کیا اس زندگی سے مطمئن ہو، جو تمہیں اب تک عطا ہوئی ہے؟"

"تمہارا بنانے والا تمہیں اتنے بڑے امتحانوں میں کیوں ڈال رہا ہے؟"

"ایسا کیوں نہیں کہ وہ پیدا کرے - زندہ رکھے آرام، سکون اور مسرتوں کے ساتھ اور ایک روز نیند کے عالم میں بے خبری کی حالت میں اُٹھا کے لے جائے - یہ ترسا ترسا کے مارنا - ذلیل کر کر کے قابلِ رحم بنا دینا - عبرتناک انجام میرے مولا تیرے اشرف المخلوقات کا جس کے آگے تم نے فرشتوں سے سجدے کرائے - کیا تو فرشتوں کے سامنے ایسا کرنا ہے؟"

سینکڑوں سوالات تھے - جنہوں نے دماغ میں حشر برپا کر دیا تھا - میرا دم گھٹنے لگا تھا - مَیں نے فیصلہ کیا کہ زندگی پہلے ہی کونسی اختیار میں ہے کہ اس کے بارے میں اپنے آپ کو پریشان کیا جائے - ہٹاؤ اس سارے قصّے کو اور چلو - جو ہونا ہے اُسے تم اپنی سوچ سے ٹال نہیں سکتے -

لندن جاتے ہوئے سارا راستہ ہوائی جہاز میں سوچتا رہا کہ پتا نہیں اب اُن کی کبھی صورت دیکھنا نصیب ہوگی، جن کو چھوڑ کے جا رہا ہوں - لیکن وقت اور فاصلہ حقیقتوں کی شدّت کو کم کر دیتے ہیں - جوں جوں جہاز آگے بڑھ رہا تھا، توں توں وہ سب جن کو پیچھے چھوڑ آیا تھا، خواب میں بدلتے جا رہے تھے - موہوم اور مبہم سے چہرے ذہن اور محسوسات کے پردے پر چلتے ہوئے معلوم ہوتے - یہ عقدہ کھُلا کہ جسے ہم حقیقت سمجھتے ہیں، وہ دراصل خواب ہے، جو گھڑی گزر جاتی ہے، وہ اگلے ہی لمحے خواب میں بدل جاتی ہے - پیچھے پلٹ کر دیکھیے، تو ماضی اور اُس کے سارے لمحے خواب بن چکے ہوتے ہیں - انہیں واپس لانا چاہیں، تو وہ کبھی لوٹ کر نہیں آتے - یہ دنیا سراب ہے، مایا ہے، خواب ہے - اس کے

نقش کاغذی ہیں ۔ اس کے رنگ کچے ہیں ۔ کوئی شے دیر پا نہیں ۔ بس وہی لمحہ زندہ حقیقت ہے ۔ جو مٹھی میں ہے ۔ اس لمحے ہی کو زندگی جانو ۔ آگے پیچھے سب خواب ہے ، دھند ہے ۔ لندن کے قریب آتے آتے نئی حقیقتوں نے میرے وجود پر قبضہ کر لیا تھا اور پرانی حقیقتیں اب خواب میں بدل چکی تھیں ۔

کل اپریشن ڈے ہے ۔ میں سینٹ تھامس ہسپتال کی سب سے اونچی منزل پر ایک کمرے میں لیٹا ہوا ہوں ۔ کھڑکی میں سے بگ بین" (BIG BEN) دکھائی دے رہا ہے دنیا کی تمام پارلیمنٹوں کی ماں انگلستان کی پارلیمنٹ کی طلسمی عمارت صدیوں کی عظمت اور حسن کو اپنے اندر لئے میرے سامنے ہے ۔ ایسے ہی خیال آیا کہ میں وہاں سے آیا ہوں جہاں نہ کوئی دستور ہے نہ پارلیمنٹ ، میں اس عمارت کو بڑی حسرت سے تک رہا تھا ، جیسے یہ میری آخری خواہش ہو جسے پورا کیا جا رہا ہے ۔

شام ڈھل رہی تھی اور ٹیمز کے کنارے بتیاں روشن ہونے لگیں ۔ چھوٹے چھوٹے جہاز ایک دوسرے کے سامنے سے گزرتے تو برات کا سا منظر دکھائی دینے لگتا ۔ میں اپنے پلنگ پر تکیہ اونچا کر کے سارا منظر دیکھ رہا ہوں ۔ ایک بڑی ہوشیار سی لیڈی ڈاکٹر تیزی سے اندر داخل ہوتی ہے ۔

"مسٹر شیخ ؟"

"یس میڈم"

"کل تمہارا اپریشن ہے ۔ دن کے گیارہ بجے "

"جی"

"اس اپریشن کی کامیابی اٹھانوے فیصد ہے ۔ ہمیں اس پر بہت کامیابی حاصل ہو چکی ہے ۔ فکر کی کوئی بات نہیں "

"اس میں کوئی خطرہ بھی ہے ؟"

"ہاں خطرات بھی ہیں۔ دورانِ اپریشن دماغ کا ایک حصہ مفلوج بھی ہو سکتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دل اگر بہت کمزور ہو چکا ہے، تو وہ دوبارہ زندہ ہی نہ ہو سکے۔"

"زندہ نہ ہو سکے؟ کیا مطلب؟ آپ دل کو مردہ کر دیں گے؟"

"جی۔ یہ اپریشن دل کو مردہ کر کے ہی کیا جا سکتا ہے۔ دھڑکتے اور حرکت کرتے ہوئے دل پہ بائی پاس سرجری نہیں ہو سکتی۔"

موت کا ایک سرد جھونکا میرے رخساروں کو چھو کر گزر گیا اور میرا چہرہ ٹھنڈا ہونے لگا۔

"دل کو کھڑا کر دینے کے بعد آپ جسم کو کیسے زندہ رکھتے ہیں؟" میں نے تشویش کے عالم میں استفسار کیا۔

"جی۔ میں آپ کو بتلاتی ہوں۔ آپ کو پوری طرح اس کی تفصیل سننا چاہیے کہ ہم آپ کے ساتھ کیا کرنے والے ہیں۔ آپ کو اس کی مکمل خبر ہونا چاہیے۔ اس سے آپ کے اعتماد میں اضافہ ہوگا۔ کیونکہ علم قوت کا دوسرا نام ہے۔

یوں ہے کہ آپ کے سینے کی ہڈیاں کاٹ دی جائیں گی تاکہ دل تک پہنچا جائے اور دل تک پہنچنے کے لئے وہ جس جھلی کے اندر بند ہوتا ہے اُسے بھی چیرنا ہوگا اور پھر دورانِ خون کو دل اور پھیپھڑوں کی مشین پر منتقل کر دیا جائے گا اور آپ کا دل رُک جائے گا، بالکل ساکت ہو جائے گا۔ آپ جب سے پیدا ہوئے ہیں، آپ کا دل مسلسل حرکت کر رہا ہے۔ اسے پہلی مرتبہ آرام ملے گا وہ خاموش ہو جائے گا۔"

"اور میں زندہ ہوں گا؟" میرے چہرے کی ٹھنڈک اب یخ بستگی میں بدلنے لگی تھی۔

آپ زندہ ہوں گے مگر مصنوعی طور پر۔ آپ کی طبّی موت واقع ہو چکی ہوگی۔ البتہ مشین کی مدد سے آپ کو زندہ رکھا جائے گا۔ آپ کے باقی جسم میں یہ مشین ہی خون کے دوران کو کنٹرول کرے گی اور آپ کے پھیپھڑوں کو آکسیجن پہنچائے گی۔"

"پھر کیا ہوتا ہے اس کے بعد؟ جیسے الف لیلہ اور قصہ چہار درویش کی داستان

سننے والا عالمِ حیرت میں غرق ہو کر پوچھ رہا ہو کہ " پھر اس شہزادے کے ساتھ کیا ہوا؟"

"اس کے بعد آپ کی ٹانگ میں سے ایک نس نکال کر دل کی اُن شریانوں پہ کاٹ کے لگا دی جائے گی۔ جہاں سے خون نہیں گزر رہا یا بہت تنگی سے گزر رہا ہے۔"

پھر......؟" میں اَب تقریباً کسی اور دنیا میں کوچ کر گیا تھا۔

" پھر آپ تندرست ہو جائیں گے اور کیا؟ ڈاکٹر نے کہانی کو ختم کرتے ہوئے کہا۔ لیکن میں اس داستان میں کہیں بہت گہرا ڈوب گیا تھا اور جب اس نے اپنی طرف سے یہ داستان یک لخت ختم کر دی، تو مجھے شدید جھٹکا سا محسوس ہوا۔

"اچھا تو یہ بتلایئے کہ یہاں آپ کا گارڈین کون ہے؟ اس کے گھر کا پتا اور ٹیلیفون نمبر ذرا لکھوا دیجئے۔"

میں نے اپنے ایک عزیز کا نام، پتا اور ٹیلی فون نمبر لکھوا دیا۔

" ایمر جینسی میں اطلاع انہیں ہی دینا ہوگی؟"

"جی ہاں"۔ " ایمر جینسی" کا لفظ میری سانس میں اٹک گیا۔

"آپ کا کسی مذہبی عقیدے سے تعلق ہے؟"

" جی ہاں۔ اسلام میرا دین ہے اور میں مسلمان ہوں۔"

یہ جواب دینے کے بعد میں نے سوچا کہ یہ سوال اس خاتون نے مجھے کیوں پوچھا ہے۔ عقیدے کا آپریشن سے کیا تعلق ہے؟ میں نے اس کا بازو پکڑ کر پوچھا۔

" یہ سوال آپ نے کیوں پوچھا ہے؟"

اِس پر اُس نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے فوراً کہا۔

"اس لئے کہ اگر آپریشن کامیاب نہ ہوا، تو ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ لاش کو ٹھکانے کیسے لگایا جائے۔"

"لاش"...... میں جو ابھی زندہ تھا اور باتیں کر رہا تھا، دیکھتے ہی دیکھتے ایک لاش

بن گیا۔ میرا جسم منوں مٹی کے نیچے چلا گیا جن میں حشرات الارض منہ کھولے میرے مُردہ جسم کو نوچنے لگ گئے۔ میں تقریباً سرد ہو گیا۔

لیڈی ڈاکٹر نے جب میری یہ حالت دیکھی، تو اُس نے فوراً ایک ٹیکا مجھے لگا دیا اور دیکھتے دیکھتے میں منوں مٹی سے نکل کے سفید، روپہلے اور سنہری بادلوں میں اُڑنے لگا۔ جسم کا بوجھ اب زمین پر کہیں گر گیا تھا اور میں ہواؤں کے دوش پر ہلکا پھلکا ہو کر ایک آزاد پرندے کی طرح اُڑ رہا تھا۔

صبح جب آنکھ کھلی، تو میں کل کا واقعہ بھول چکا تھا۔ آنکھ کُھلتے ہی کمرے کا دروازہ بھی کُھل گیا اور ایک دوہرے جسم کا آدمی جس کی شیو کئی دنوں سے بڑھی ہوئی تھی قمیض کے بٹن کُھلے ہوئے تھے اور پتلون نیچے کو ڈھلکی ہوئی تھی اندر داخل ہوا۔ اُس نے میری جانب دیکھے بغیر پوچھا "شیونگ صابن کہاں رکھا ہے؟" میں نے کہا "وہ سامنے شیلف کے پاس پڑا ہے" اُس نے شیونگ صابن اُٹھایا اور اس کے برابر رکھا ہوا شیونگ برش بھی اور مجھے کہا کہ ذرا قمیص جسم سے ہٹا دو۔

میں نے پوچھا "تم کون ہو اور کیا کرنا چاہتے ہو؟"

اس نے کہا "مجھے جان کہتے ہیں اور میں آپریشن سے پہلے مریضوں کے جسم کے اِن حصّوں کی شیو کرتا ہوں، جہاں سرجری کرنا ہوتی ہے"

یہ جملہ اُس نے بڑی آہستگی سے کہا جیسے اپنے آپ ہی کو بتلا رہا ہو۔ اس کے آدھے لفظ میری سمجھ میں آئے اور آدھے اُس کے منہ ہی میں رہ گئے۔ وہ لفظوں کو منہ میں یوں گھماتا تھا جیسے میٹھی گولی چوس رہا ہو۔ اس نے میرے سینے پر شیونگ بُرش سے جھاگ اُڑانا شروع کر دی، لیکن وہ بُرش اس طرح چلاتا تھا کہ جھاگ کے چھینٹے اُڑ کر میرے منہ کی طرف ہی آتے تھے۔ اپنی جانب برش کو وہ اس آہستگی سے موڑتا کہ ایک بھی چھینٹا نہ اُڑنے دیتا۔

جان ہر صبح مریضوں کے بال صاف کر کر کے دنیا سے سخت بیزار دکھائی دیتا تھا اور اپنا سارا ایگریشن جھاگ کے چھینٹے مریضوں کی طرف اُڑا کے نکالتا تھا۔ پھر اس نے حکم جاری کرتے ہوئے کہا کہ پاجامہ اُوپر کروں اور بائیں ران پر صابن کی جھاگ لگائی۔ میں نے پوچھا۔ "مسٹر جان اس ران پر جھاگ کیوں بنا رہے ہو؟"

مسٹر جان نے پھر اپنے آپ سے گفتگو کرتے ہوئے بتلایا: "اس کھیت میں سے ایک پکی ہوئی نس نکالی جائے گی۔"

میں نے کہا: "جان! یہ تو ران ہے، کھیت کیسے ہے؟"

جان نے زور سے ایک برش میری جانب چلایا اور جھاگ کے چھینٹے میرے پیٹ پر پھیل گئے۔

"ہاں۔ کھیت کی سمجھ نہیں آئی، تو پھر یوں سمجھ لو کہ ٹانگوں کے اندر دل کے سپیئر پارٹس (SPAREPARTS) ہوتے ہیں۔ پھر اس نے ایک ملفوف سا قہقہہ لگایا۔ دل بھی چلنے کے لئے ٹانگوں ہی کا محتاج ہے۔ ہیں ہیں ہیں" اس نے پھر منہ میں میٹھی گولیاں گھمائیں مگر یہ الفاظ میرے پلے بالکل نہ پڑ سکے۔

اَب میں اپریشن کے لئے تیار کر دیا گیا تھا۔ قمیص پاجامہ اُتار کر ایک لمبا سفید سا چُغہ پہنا دیا گیا تھا جسے آسانی سے کھولا اور اُتارا جا سکتا تھا۔ سفید چُغہ کفن کی شکل کا تھا صرف مشک کافور کی بُو اس میں سے نہیں آ رہی تھی۔ سفید رنگ موت کا رنگ ہے۔ صبح کے دس بج چکے تھے کہ ایک نرس نے آ کر کہا "ٹیکہ لگانا ہے"۔

"کیوں؟ بے ہوش کرنے کے لئے تو نہیں ہے؟"

"نہیں۔ صرف تشویش ختم کرنے کے لئے۔"

جب ٹیکہ لگا، تو میں باتیں کر رہا تھا، مگر ہر قسم کی تشویش مجھ سے کوسوں دور بھاگ گئی تھی۔ بعد میں مجھے بتلایا گیا کہ تم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ مگر مجھے کچھ

یاد نہیں میں نے کیا باتیں کیں۔ شعور اور لاشعور کی حدیں آپس میں گڈ مڈ ہو گئی تھیں۔ نہ روشنی پوری طرح غائب ہوئی تھی اور نہ شام گہری ہوئی تھی۔ زندگی اب روشنی اور اندھیرے کے درمیان کہیں تھی۔ آفتاب اُفق کے نیچے جا چکا تھا مگر اُفق پہ پوری طرح سیاہی ابھی تک نہیں پھیلی تھی۔ یہ وہ لمحہ تھا۔ جب دونوں وقت آپس میں ملتے ہیں

آنکھیں کھلی تھی مگر اشیاء کی شکلیں پرے دہ کر گئی تھیں بس سٹریچر کے پہیوں کی کھٹ کھٹ کانوں میں سنائی دے رہی تھی۔ سفر شروع ہو چکا تھا۔ اِس ہونے اور نہ ہونے کے درمیان اچانک ایک امیج میرے دائیں طرف نمودار ہوا میں اس کی طرف متوجہ ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میری ماں جو کئی سالوں سے بے ہوشی کے عالم میں تھی اور جسے میں چلتے وقت خدا حافظ کہنے گیا تھا تو صرف اس کے قدموں کو چھوا تھا اور اس سے معاف کر دینے کو کہا تھا تو وہ اسی طرح بے ہوش مردہ سی پڑی رہی۔ اُسے کچھ پتا نہیں تھا کہ یہ کون اس کے قدموں کو چھو رہا ہے اور کون اُس سے معافی مانگ رہا ہے وہ نیم مردہ ماں اب یہاں اپنے قدموں پر میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھی اور اپنا ایک ہاتھ میرے ماتھے پہ رکھا ہوا تھا۔ چہرہ پریشانی سے سرخ اور ہونٹ ہلتے ہوئے۔ باربار میری طرف دیکھتی۔ ہونٹوں کی حرکت میں تیزی تھی اور وہ دعائیہ الفاظ ادا کرتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ یہ امیج آخری امیج تھا جو میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا اور جو ہوش میں آنے کے بعد بھی مجھے یاد رہا۔ جس وقت اپریشن تھیٹر کا دروازہ سامنے آیا تو ماں مجھے خدا حافظ کہہ کے چلی گئی۔

اس کے بعد کچھ پتا نہیں۔ اب اندھیرا بہت گہرا ہو گیا تھا چاروں طرف تاریکی چھا چکی تھی۔ زندگی کی شمع گل ہو گئی تھی۔

انہوں نے پھر کیا کیا۔ الف لیلہٰ اور قصہ چہار درویش کی داستانوں کے طلسمی سحر میں کیا کیا معرکے سرزد ہوئے زندگی اور موت آپس میں کیسے اور کب تک گتھم گتھا

رہے؛ موت زندگی کے تعاقب میں سرپٹ دوڑ رہی تھی اور زندگی بخشنے والے ہاتھ اُس کے منہ میں لگامیں دے رہے تھے۔ موت و حیات کی کشمکش میں کائنات کی ساری قوّتیں تماشائی بن جاتی ہیں۔ زندہ دل کو مردہ کر کے پھر زندہ کرنے کی تگ و دو ہو رہی ہو گی۔ یہ تو پیغمبروں کا کام ہے۔ حضرت عیسٰیؑ مُردوں کو زندہ کر دیتے تھے۔ مسیحائی اِسے ہی تو کہتے ہیں اور یہ انہی لوگوں کو عطا ہوتی ہے جو کائنات کے رازوں کے جاننے کے لئے اپنی زندگیاں تیاگ دیتے ہیں۔ وہ کائنات پر غور کرتے ہیں اور اس کے عوامل کو اپنی گرفت میں لانے کی جد و جہد میں مصروف ہو جاتے ہیں اور پھر انہیں اس قدر قوّت حاصل ہو جاتی ہے کہ وہ موت پر قادر ہو جاتے ہیں اور زندگی کو کچھ دیر کی مُہلت دے دیتے ہیں۔ ایسے انسان خدائی طاقتوں کا مظہر ہیں، جو انسان اور انسانیت کی خدمت کے لئے موقف ہوتی ہیں۔ یہ لوگ ازلی سچائی کے امین ہیں۔ انسانی جسموں سے دُکھوں کو دور کر کے رُوح کو سکون بخشتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے کوئی دعوے نہیں۔ انہیں کسی جنّت کی بشارت کی ضرورت نہیں۔ یہ خدا کے بنائے ہوئے بندوں کے عذابوں کو کم کرتے ہیں۔ عذاب ان کے نزدیک کیسے آسکتا ہے؟

اس کے بعد کیا ہوا، کیا نہیں ہوا۔ کچھ پتا نہیں، مُردے کو کیا پتا ہوتا ہے اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔

پھر زندگی جب واپس لوٹ رہی تھی، تو جھٹپٹے میں اندھیرا اور روشنی ایک دوسرے سے باہم ملے ہوئے تھے۔ ڈُوبی ہوئی کشتی سطحِ آب پہ آ رہی تھی، تاریکی جا رہی تھی صبح کی نرم روشنی اُتر رہی تھی۔ خواب کا سا عالم تھا۔ ہونے نہ ہونے کا درمیانی وقفہ بھی کیا خوبصورت ہوتا ہے۔ اِس دُھندلکے میں ایسے لگ رہا تھا۔ جیسے سامنے سفید شفاف لباس پہنے ایک حُور سی صورت دکھائی دیتی ہے اور چھُپ جاتی ہے۔ زندگی ابھی موت کے سمندر میں ہچکولے کھا رہی تھی۔ کبھی ڈوب جاتی تھی۔ کبھی اچانک سطحِ آب

پہ آجاتی تھی۔ ہوش اور بے ہوشی کے خطوط باہم گڈمڈ ہو گئے تھے۔ زندگی کی سرحدیں واضح نہ ہوتی تھیں۔

اس حور سی صورت کو میں نے بے ہوشی میں آواز دی۔ آواز بڑی مدھم تھی۔ اتنی مدھم کہ جیسے میں اپنے آپ سے کچھ کہہ رہا ہوں۔

"کیا بات ہے میں صبح سے آپریشن کے انتظار میں لیٹے لیٹے تھک گیا ہوں۔ اب تو دوپہر بھی ڈھل چکی ہے۔ میرا آپریشن کب ہوگا؟"

حور سی صورت میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ میری طرف بڑھی اور قریب آ کے کہا:

"مبارک ہو۔ تمہارا اپریشن ہوگیا ہے۔ تم زندگی میں واپس لوٹ آئے ہو۔" یہ کہتے ہوئے ایک مسکراہٹ اُس کے چہرے پر پھیل گئی اور گلاب کا ایک سُرخ پھول اُس نے میری طرف بڑھایا اور میرے سرہانے کے پاس رکھ دیا۔

یہ نہایت نگہداشت کا کمرہ تھا اور یہ حور صورت نرس مجھے ہوش اور بے ہوشی کے درمیان ڈوبتے، ابھرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ دُھندلکا ابھی پوری طرح چھٹا نہ تھا۔ آوازیں سنائی دینے لگی تھیں، مگر آنکھوں کی پُتلیاں ابھی پھیلی ہوئی تھیں، چہرے اور اشیاء ابھی فوکس سے باہر تھے۔

میں نے اپنی جانب دیکھا، تو دو ربڑ کی نالیاں میرے پیٹ میں نصب تھیں ایک گردن کے اندر دائیں جانب سے گھُسی ہوئی تھی۔ ایک جسم کے نچلے حصّے میں تھی۔ معلوم ہوا کہ کوئی حادثہ ہوگیا ہے۔ اس حور صفت نے جب دیکھا کہ میں بولنے لگا ہوں۔ تو اُس نے جھٹ سے تمام نالیاں جسم سے الگ کر دیں اور سٹریچر پھر چلنے لگا۔ پہیوں کے درمیان کھٹ کھٹ کی آواز۔ روشنی کبھی آنکھ کے پردوں کو چھُو جاتی مگر پھر اندھیرا سا چھا جاتا تھا۔ واپسی پر میری ماں سٹریچر کے ساتھ نہ تھی اور میں زندگی میں واپس لوٹ

آیا تھا۔

اُس روز کمرے میں میرے اِرد گرد بہت سی آوازوں کا شور تھا۔ مبارک مبارک کا ایک ہنگامہ تھا۔ پھول ہی پھول تھے۔ مگر کوئی چہرہ صاف دکھائی نہ دیتا تھا۔ یعنی کانوں کے پردے تو جاگ اُٹھے تھے مگر آنکھ ابھی تماشا نہ دیکھ پاتی تھی۔

ٹیلی فون کی گھنٹی بار بار بجتی تھی۔ سمندر پار کی آوازیں جنہیں سُن کر اندھی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آجاتے تھے۔ یہ کیوں اتنا تڑپ رہے ہیں؟ کیوں اس قدر بے چین ہیں؟ مَیں ان سے کیا کہوں۔ کچھ کہنے لگتا ہوں تو آواز میں لرزہ آجاتا ہے، سانس اُکھڑ جاتی ہے۔ ان کی بے چینی آواز کو اور بے چین کر دیتی ہے۔

وہ دن بس سوتے جاگتے کے عالم میں گزر گیا۔ دوسری صبح جب پَو پھٹ رہی تھی، تو آنکھوں کا فوکس درست ہو گیا۔ سامنے کونے میں ٹی۔ وی سیٹ دکھائی دیا۔ وہیں لیٹے لیٹے ری موٹ کنٹرول سے اس کا بٹن دبایا۔ ایک نہایت ہی دلآویز کامپیئر آکوچے جیسے سُرخ ہونٹوں کے ساتھ خبریں سُنا رہی تھی۔ اُس کی مسکراہٹ اور غیر رسمی انداز سے لگتا تھا کہ خبر بھی زندگی کی عام سرگرمی ہے۔ کوئی وعظ نہیں جسے ضرورت سے زیادہ سنجیدہ بنا دیا جاتا ہے۔

اتنے میں ایک سپینش الھڑ سی لڑکی نے دروازہ کھولا اور صبح کی چائے ٹرے پہ رکھ کے لائی۔ بڑی گرمجوشی سے سلام کیا۔ خوش آمدید کہا اور اپنے نرم و نازک ہاتھوں سے ایک پیالی بنا کے دی۔

دس بجے تک ٹی۔ وی پروگرام دیکھتا رہا۔ یہ پروگرام اس قدر دلچسپ تھے کہ لگتا تھا کہ ان کے دیکھنے سے مجھے شفا ہونے لگی ہے۔ ورنہ گھر میں تو اب یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ ٹی۔ وی کے سامنے بیٹھ بیٹھ کے بیمار ہو گیا ہوں۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک خاتون اندر آئی۔ دُبلی پتلی مگر ذرا پختہ چہرہ۔ سنہرے بال کندھوں پر گرتے

ہوئے، اپنا تعارف کروایا کہ فزیوتھیرے پسٹ ہوں۔ بڑے پیار بھرے لہجے میں گفتگو شروع کی۔ کہا کہ جسم کے ساتھ جو ہونا تھا وہ تو ہوگیا۔ اب اس کٹے پھٹے پیوند لگے جسم کو نارمل بنانے کے لئے قوتِ ارادی اور ذہنی پختگی کی ضرورت ہوگی اور وہ ان دونوں قوتوں کو بحال کرنے کے لئے روزانہ آیا کرے گی۔

چنانچہ سب سے پہلے تو اُس نے اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ بستر سے اُٹھیے اور میرے ساتھ باہر برآمدے میں قدم ہلا کے چلئے۔

لیکن یہاں اُٹھنے کی ہمت کسے تھی۔ میں نے پاؤں سے چادر کھینچ کے اُوپر اُوڑھ لی اور کہا کہ سینہ سارا کٹا پڑا ہے۔ جسم میں ذرا طاقت باقی نہیں رہی، ایسے میں کھڑے ہونا کیسے ممکن ہے؟

"جسے تم ناممکن سمجھ رہے ہو، دراصل وہ ممکن ہے۔"

"کیسے ممکن ہے۔ میں اس کی ہمت اپنے اندر نہیں پاتا۔"

"یہ صرف تمہارے دماغ کی سوچ ہے۔ ایک خوف ہے، ایک ڈر ہے۔ اس خوف اور ڈر کو زور سے دھکا دے کے باہر نکالو اور دیکھو کہ تم اپنے آپ کو پاؤں پہ کھڑا پاؤ گے۔"

"خوف اور ڈر تو مجھے بڑے عزیز ہیں۔ یہ مجھے اپنے بہن بھائی اور غمخوار لگتے ہیں۔ میں تو ان کے درمیان پلا بڑھا ہوں۔ یہ میرے محافظ ہیں۔ صرف تمہارے ایک کہنے پہ تو انہیں اپنے سے جُدا نہیں کر سکتا۔"

"لیکن تمہیں معلوم نہیں کہ خوف اور ڈر کا اصل مرحلہ تو اب گزر گیا۔ جب تم بے ہوش تھے اور مُردہ ہو گئے تھے اور تمہارا سارا جسم کٹا ہوا تھا۔ وہ سخت وقت تو گزر گیا۔ اب دل صحت مند ہو کے دھڑک رہا ہے، تم اب بالکل صحت مند آدمی ہو۔ صحت مند آدمی چارپائی سے محبت نہیں کیا کرتے۔ اُٹھو۔ اُٹھو" اور یہ کہتے ہوئے اس نے میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لئے اور اپنی طرف کھینچتے ہوئے مجھے پلنگ پہ بٹھا دیا اور

پھر نیچے اُتار کر کھڑا کر دیا۔

بے شک جسموں کے لمس میں جادو ہے اور شفا ہے۔ ہمیں لمس کا شدید خوف ہے۔ ہر شے جس سے خوشی، مسرت یا انبساط ملتی ہے اس سے ہم آنکھیں چُراتے ہیں۔

میں فزیوتھیراپسٹ کے ساتھ اب برآمدے میں آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ ہر قدم کے ساتھ اعتماد کی ایک لہر ذہن کی دیواروں سے ٹکراتی ـــــ سینے پہ یُوں لگ رہا تھا، جیسے پتھر کا ایک بڑا بھاری ٹکڑا نصب ہو گیا ہے، جسے میں اُٹھائے اُٹھائے چل رہا ہوں مگر جُوں جوں میں چلتا گیا اس پتھر کا بوجھ ہلکا ہوتا چلا گیا۔ اس خاتون نے کہا کہ جتنا زیادہ چلو گے اتنا ہی سینے کا بوجھ اُترتا چلا جائے گا۔ چلتے وقت وہ مجھ سے بیماری یا آپریشن کی کوئی بات نہ کرتی۔ فقط میری دلچسپیوں کے بارے میں پوچھتی۔ بیوی بچوں کے بارے میں تفصیلات چھیڑ دیتی اور پھر جب میں بستر پہ لیٹ جاتا، تو وہ مجھے ان تمام خوفوں اور خدشوں کے بارے میں پوچھتی، جو میرے دل و دماغ کو گھیرے ہوئے تھے اور پھر ایک ایک سوال کا جواب دیتی، جس سے میں اپنے تیئں بہت مطمئن پاتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ایسی شکستہ حالت میں یہ خاتون میرے ساتھ نہ ہوتی اور میرے ساتھ مکالموں کے ذریعے سے میری زندگی کی آس نہ بڑھاتی، تو میں جسمانی طور پر بہتر محسوس کرنے کے باوجود بھی دماغی طور پر سنبھل نہ سکتا۔ اُس سے باتیں کرتے ہوئے یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ اپنی باتوں سے برقی رو میرے جسم کے اندر دوڑا رہی ہے اور میرے کھوئے ہوئے اعتماد کو بحال کر رہی ہے۔

ایک روز اُس نے مجھ سے آئندہ زندگی کے لئے ان احتیاطوں کا ذکر چھیڑ دیا، جو مجھے اپنے آپ کو صحت مند رکھنے کے لئے اپنانا ہوں گی۔ اس میں خوراک، روز مرّہ کی مصروفیات اور دیگر باتوں کا تذکرہ کرتے کرتے اس نے پوچھا۔ تمہاری سیکس لائف ایکٹو ہے؟"

میں نے کہا "میں شادی شدہ آدمی ہوں۔"

"شادی شدہ ہونے کا مطلب یہ ضروری نہیں ہوتا کہ تم سیکس لائف بھی بسر کر رہے ہو، جیسے بعض لوگ غیر شادی شدہ ہوتے ہیں مگر ان کی سیکس لائف بڑی ایکٹو ہوتی ہے۔"

مجھے پہلی مرتبہ محسوس ہوا کہ جنسی طور گھٹے ہوئے ایک معاشرے میں پلے بڑھے ہوئے مرد کے لیے جنسی حقائق کا برملا اعتراف بھی کس قدر ناممکن ہو جاتا ہے، جیسے اُس نے کچھ کہہ دیا، تو وہ ننگا ہو جائے گا اور لوگ اُسے اُس حالت میں دیکھ لیں گے اور اُس کے عزت واحترام کا جامہ سرِ بازار اُتر جائے گا۔ گھٹے ہوئے معاشرے میں سیکس چوری چھپے کا کام ہے۔ ایک جرم ہے، ایک کمزوری ہے جسے ظاہر کرنا اپنے آپ کو کمزور ثابت کرنے کے مترادف ہے۔ اُس نے میرے چہرے پہ تذبذب کی کیفیت بھانپتے ہوئے سوال کا رُخ بدل دیا۔

"دیکھو۔ تمہارے سینے کی ہڈیاں کاٹ دی گئی تھیں اب یہ تاروں کے ساتھ جوڑ دی گئی ہیں۔ لیکن ابھی یہ کچی ہیں۔ یہ ہڈیاں اتنی مضبوط نہیں ہوتیں۔ انہیں پوری طرح جڑتے اور طاقت پکڑتے کچھ عرصہ لگ جاتا ہے۔ پہلے ایک سال جب تم کسی کو گلے لگاؤ، تو زور سے دبانا نہیں۔"

"مگر میں تو ایسے معاشرے سے تعلق رکھتا ہوں جہاں لوگ ایک دوسرے کو جب تک گلے نہ ملیں ملاقات میں کوئی گرمی ہی محسوس نہیں ہوتی۔ ہمارے تہواروں میں عید ہے، عید کے روز تو ہم ایک دوسرے سے تین تین مرتبہ گلے ملتے ہیں۔ کسی سفر پہ جائیں تو گلے ملتے ہیں، حج سے واپس لوٹیں، تو گلے مل مل کے نڈھال ہو جاتے ہیں۔ پھر گھر کے اندر ہم ماں، بہن، بیٹی اور بیٹے سے گلے ملتے ہیں......"

"بیوی سے گلے نہیں ملتے؟" اُس نے میری بات کاٹتے ہوئے حیرانی سے پوچھا۔

"بیوی سے بھی گلے ملتے ہیں مگر سب کے سامنے نہیں۔ تخلیے میں اور اس کا

ذکر کبھی بیوی سے بھی نہیں کرتے۔"

"آپ لوگ اپنی بیویوں سے شرمندہ ہیں؟"

"نہیں بس اُس تعلق سے شرمندگی محسوس کرتے ہیں، جو میاں بیوی کے درمیان ہوتا ہے، اس کا ذکر ہمارے یہاں معیوب سمجھا جاتا ہے۔"

"لیکن مرد اور عورت کے درمیان محبت کا اظہار اتنا ہی فطری ہے، جتنی کہ محبت۔ پھر آپ شرمندہ کس بات پہ ہوتے ہیں؟"

"نہیں نہیں۔ ایسی بات بھی نہیں۔ مرد جب مل بیٹھتے ہیں، تو آپس میں اکثر نوٹس ایکسچینج کر لیتے ہیں، میرا مطلب ہے، جو ذرا بے تکلف سے ہوتے ہیں مگر شرفاء اور سنجیدہ لوگ ایسا بھی نہیں کرتے۔"

"کیا آپ کے یہاں شرفاء سیکس کو غیر سنجیدہ سرگرمی سمجھتے ہیں؟"

"معلوم نہیں، مگر جیسا کہ آپ جانتی ہیں، اس میں لذت تو حاصل ہوتی ہے ناں؟"

"ہاں ہاں۔ کیوں نہیں؟ تو؟"

"تو؟ کچھ نہیں۔ جس چیز سے لذت حاصل ہو، وہ ہمارے یہاں ....."

"حرام ہے؟"

"نہیں حرام تو نہیں۔ لذتوں کو ہم حلال کر کے اپنی زندگی میں لاتے ہیں، وہ جائز ہو جاتی ہیں مگر ہم انہیں چھپا کے رکھتے ہیں جیسے کوئی راز ہو۔ ہم محبت کرتے ہیں مگر ڈرتے ڈرتے۔ جھجک جھجک کے ....."

"جیسے کوئی جرم کر رہے ہوں ....؟" اس کی حیرانی میں اضافہ ہوتے چلا جا رہا تھا۔

"نہیں جرم تو نہیں۔ بس یوں سمجھ لیجئے۔ کوئی مناسب لفظ مجھے نہیں مل رہا، دراصل خوشیاں اور لذتیں ہمارے یہاں ہوتی ہیں مگر ایسے جیسے کوئی بے نکاحی

عورت گھر میں رہ رہی ہو۔"

"میں سمجھی نہیں۔"

"میرا مطلب ہے، بس آپ سمجھ ہی گئی ہوں گی۔ ہر بات کہنے کی نہیں ہوتی۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ لوگوں کے دو چہرے ہیں۔ ایک شرافت کا اور ایک اس کے نیچے اصل آدمی کا، جو خوشیوں اور مسرتوں میں یقین رکھتا ہے مگر ان کا اعتراف برملا نہیں کر سکتا۔ یہ تو ہیپوکریسی ہے؟"

"نہیں نہیں۔ ہرگز نہیں۔"

"کیوں نہیں۔ جب کندھوں پہ دو چہرے لگانے پڑیں، تو آدمی ہیپوکریٹ ہو جاتا ہے اور کیا؟ اچھا یہ بتلاؤ کہ موسیقی، مصوری، مجسمہ سازی اور ناچ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ ان سے بھی تو مسرت و انبساط حاصل ہوتا ہے۔"

"ہاں یہ ہمارے درمیان موجود ہیں۔ جیسے بے نکاحی عورتیں۔"

"یعنی انہیں اختیار کرتے ہوئے آپ احساسِ جرم کا شکار رہتے ہیں۔"

"ہم کیا ہمارے فن کار بھی اس احساسِ جرم کا شکار رہتے ہیں۔ ان میں سے بعض کام کرنے سے پہلے اپنے گناہوں کی معافی بھی مانگ لیتے ہیں۔"

"تو آپ کے یہاں موسیقار، مصور اور نرتکی ہوتے ہیں؟"

"بالکل ہوتے ہیں۔ مگر یہ عزت دار لوگ نہیں کہلاتے۔ اپنے آپ سے چھپتے پھرتے ہیں۔"

"حیرت ہے۔ یہ لوگ تو حسن کے خالق ہوتے ہیں۔

"حسن ہمارے یہاں پہاڑوں، ندی، نالوں اور پھولوں میں ہوتا ہے۔ موسیقی کے سُروں، خوبصورت رنگوں والی جاندار تصویروں، پتھر کے مجسموں اور ناچنے والوں کے پاؤں کے تال میں نہیں ہوتا۔

"میری سمجھ میں نہیں آرہا تم کیا کہہ رہے ہو۔"

"تم اچھی طرح سمجھ گئی ہو اور تم نے کہہ بھی دیا ہے۔"

وہ گھبرا سی گئی اور فوراً ہی معذرت خواہانہ انداز میں بولی۔

"آئی ایم سوری۔ مَیں نے تمہارا دل تو نہیں دُکھا دیا۔"

"نہیں نہیں۔ کس بات پہ؟"

"یہ دو چہروں کا ذکر کرکے۔ اچھا چھوڑو ان باتوں کو تم کیا محسوس کر رہے ہو؟"

"میں محسوس کر رہا ہوں کہ میرے دو دل ہیں۔"

"کیا؟"

"ہاں ہاں۔ دو دل۔ ایک صرف دھڑکنے کیلئے ایک محسوس کرنے کے لئے۔ ایک جو انجیوگرافی میں دیکھا جا سکتا ہے اور ایک وہ جو نگاہ سے چھپا ہوتا ہے۔"

"معلوم ہوتا ہے تم نے میری باتوں کو محسوس کیا ہے۔ میں معافی چاہتی ہوں۔"

اس پہ مَیں زور سے ہنس دیا۔ اُس نے مجھے فوراً روکا۔ ابھی اس قدر زور سے قہقہہ لگانا ٹھیک نہیں۔ پھیپھڑوں پہ زور پڑے گا اور سینے کی ہڈیاں ابھی بالکل ہی کچی ہیں اور پھر تمہیں اس قدر خوش بھی نہیں ہونا چاہئیے۔ تم نے ابھی بتلایا ہے ناں کہ خوشیاں آپ لوگوں کی صحت کے لئے ٹھیک بھی نہیں۔"

مَیں ایک دم چُپ ہو گیا۔

"تو میں یہ کہہ رہی تھی کہ سیکس لائف میں کچھ عرصہ احتیاط کرنا ہوگی۔"

"کیسی احتیاط؟ تمہارا مطلب ہے مکمّل پرہیز۔"

"ہرگز نہیں۔ سیکس تو بڑی صحت مند ایکٹیوٹی ہے۔ اس سے بیمار کو صحت ملتی ہے۔ میں کہنا یہ چاہتی ہوں کہ جن لوگوں کی اوپن ہارٹ سرجری ہوئی ہوا نہیں جنسی ملاپ میں ایسی حالتوں میں پرہیز کرنا چاہئیے، جن سے سینے کے اُوپر بوجھ پڑے۔"

"لاحول ولاقوۃ"، مجھے یوں لگا جیسے اب وہ کوک شاستر کھول کر بیان کرنے لگی ہے۔
جنسی گھٹن کے معاشرے کے مرد سے جب کوئی عورت جنسی زندگی کی بات کرنے لگے، وہ معالج ہی کیوں نہ ہو، تو وہ یہ سمجھنے لگ جاتا ہے کہ یہ تو بے تکلف ہونے لگی ہے اور راز داری کے ممنوعہ علاقے میں گھس آئی ہے۔ فزیوتھیرپسٹ اب مجھے عورت دکھائی دینے لگی تھی اور میں نے اُس کے باریک ہونٹوں اور کاغذی نتھنوں کی موومنٹ میں ایک عجب کشش محسوس کی۔ جی چاہتا تھا کہ یہ ہونٹ ہلتے رہیں اور وہ اسی طرح باتیں کرتی رہے۔ باتیں کرتے کرتے وہ ایک دم خاموش ہوگئی۔

"مجھے لگ رہا ہے تم میری باتوں کو مریض بن کے نہیں سُن رہے؟"

"ہاں۔ تم نے ٹھیک ہی محسوس کیا ہے۔ ایسی باتیں میں زندگی میں پہلی مرتبہ ایک عورت کی زبانی سُن رہا ہوں۔"

"تمہارے یہاں عورتیں ایسی باتیں نہیں کرتیں؟" پھر حیرت اور استعجاب۔

"جو کرتی ہیں وہ بدمعاش سمجھی جاتی ہیں۔"

"لیکن میں تو تمہاری معالج ہوں۔ میرے فرائض میں شامل ہے کہ مریض خواہ عورت ہو یا مرد، اُس کو صحت مند زندگی بسر کرنے کے لئے وہ سب کچھ تبلاؤں، جو ضروری ہے۔"

میں نے محسوس کیا کہ اُس کا لہجہ دھیما پڑ گیا اور وہ میرے ردِّعمل سے پہلے حیرت زدہ ہوئی پھر مایوس اور پھر چپ ہو گئی۔ مجھ سے اُس کی یہ چُپ دیکھی نہ گئی اور جب وہ گڈ نائٹ کہہ کے مڑنے لگی، تو میں نے کہا۔۔

"تم کچھ مایوس اور چُپ سی ہوگئی ہو۔ میں نے اگر کوئی بات کہہ دی ہے، جو تمہیں ناگوار گزری ہے، تو میں معافی چاہتا ہوں۔ تمہاری وجہ سے تو میں اپنے آپ کو نارمل محسوس کرنے لگا ہوں اور میری صحت مجھے واپس ملنے لگی ہے۔"

وہ یہ سن کر مسکرا دی اور کہا۔

"نہیں نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ مجھے مایوسی صرف اس بات پہ ہوئی ہے کہ تم جسمانی طور پر صحت مند تو ہو جاؤ گے مگر اس صحت کا فائدہ؟"

"کیا مطلب؟ صحت ہو گئی، تو میں جو چاہوں گا کھاؤں گا پیوں گا اور ان تمام ہدایات پر جو تم نے بتلائی ہیں عمل کرتے ہوئے ایک توانا زندگی بسر کروں گا۔"

"لیکن یہ محض اینیمل (ANIMAL) لائف ہو گی۔ تم بیمار لوگ ہو"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟" میں پلنگ پر اُٹھ کے بیٹھ گیا۔

"تم لوگ سچ نہیں بول سکتے اور جو سچ نہیں بول سکتے۔ اُن کے کندھوں پہ چہروں کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔"

"اور ۔۔۔۔؟"

"اور یہ کہ جو حُسن سے خائف ہو۔ وہ حُسن کی پہچان کا نااہل ہو جاتا ہے۔ تخلیق کے قابل نہیں رہتا۔ بانجھ ہو جاتا ہے۔ وہ تو بے آب و گیاہ دشت میں پڑا ہوا ہے۔" وہ بولے جا رہی تھی اور میں اس کی جانب حیرت سے تک رہا تھا۔ اُس نے دل نشین لہجے میں ایک بار پھر مجھے گڈ نائٹ کہا اور اب کے ہیو گڈ ڈریمز (HAVE GOOD DREAMS) کا جُملہ بھی بڑھا دیا۔

اُس رات خواب میں مَیں اپنے آپ کو ایک تپتے ہوئے صحرا کی ریت میں گھومتا ہوا دیکھتا رہا۔ چاروں جانب ہُو کا عالم۔ اپنی آواز لوٹ کے واپس کانوں سے ٹکراتی رہی۔ حلق میں پیاس سے کانٹے چبھنے لگے تھے اور میں دائیں بائیں دوڑ رہا تھا، سائے کی تلاش میں، ٹھنڈک کی تلاش میں، پانی کی تلاش میں۔ پانی اور سایہ جو زندگی کے امین ہیں۔

ہسپتال میں ابھی تیسرا روز تھا کہ کمرے میں ایک جواں سال نہایت خوبصورت

نیلی نیلی آنکھوں والی سکاٹش نرس داخل ہوئی اور مسکراتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔

"مسٹر شیخ! چلئے ذرا شاور لے لیں"۔

میں نے اُس کی جانب اس طرح دیکھا، جیسے مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا کہ اس نے کیا کہا ہے۔

"میں کیسے نہا سکتا ہوں۔ میرا تو ابھی دو روز ہوئے اپریشن ہوا ہے"۔

"ہاں۔ اسی لئے۔ اب آپ بالکل ٹھیک ہیں۔ نہانے سے جسم اور بہتر محسوس ہوگا"۔

"نہیں نہیں۔ مجھے تو اس حالت میں باتھ روم کے نام ہی سے خوف آرہا ہے"۔

"نہیں ڈریے نہیں۔ میں تمہارے ساتھ باتھ روم میں چلوں گی"۔

میری حیرت دوگنی ہوگئی۔

"آپ باتھ روم میں میرے ساتھ چلیں گی؟" میں نے پوچھا اور میرا منہ جواب کے لئے کھُل گیا۔

"ہاں۔ مجھے آپ کو نہلانا ہے اور یہ نہایت ضروری ہے"۔

میں یہ آرڈر سن کے اُٹھ کھڑا ہوا اور بادلِ نخواستہ باتھ روم کی طرف یہ سوچتے ہوئے چلنے لگا کہ یہ باہر چوکیداری کرے گی اور میں اندر غسل کر کے اس کے ساتھ ہی باہر آجاؤں گا۔ باتھ روم کے دروازے میں داخل ہونے کے بعد اسے بند کرنے کے لئے چٹخنی تلاش کی، تو معلوم ہوا کہ اِن باتھ روموں کے اندر چٹخنیاں لگائی ہی نہیں جاتیں تا کہ دل کے مریض اندر سے دروازہ بند نہ کر دیں۔ میں نے اندر داخل ہو کر کپڑے اُتارے ہی تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ سکاٹش نرس کی آواز تھی۔

"مسٹر شیخ! کپڑے بدل لئے آپ نے؟"

"جی۔ بدل لئے"۔

"اچھا"... اور یہ کہہ کر اس نے دروازے کو آہستہ سے دھکا دے کر کھول دیا اور باتھ روم کے اندر آ گئی۔ میں ایک دم گھبرا گیا اور جھٹ سے تولئے کو ہینگر سے کھینچ کے کمر کے گرد لپیٹ لیا۔ پسینے کے قطرے میرے ماتھے پہ نمودار ہونے لگے اور تھوڑی تھوڑی کپکپی بھی جسم میں شروع ہو گئی۔ میرے اندر کا مشرقی مرد اس حادثے سے ہانپنے لگ گیا۔

وہ بولی۔ "یہ تولیہ کیوں باندھ لیا ہے۔ آپ نے نہانا نہیں ہے؟"

"نہانا ہے مگر عورتوں کی موجودگی میں ننگے ہو کر نہیں نہاتے۔"

"مسٹر شیخ! تم ایشیائی ہو؟"

"ہاں"

وہ ہنسنے لگ گئی۔

"تم لوگ مریض ہوتے ہوئے بھی مرد ہی رہتے ہو۔" وہ بولی

"مرد، مرد ہی رہتا ہے وہ صحت مند ہو یا مریض۔"

"تم لوگ باتھ روموں میں اکیلے ہی نہاتے ہو؟"

"تو کیا بال بچوں سمیت نہائیں؟"

"وہ اور زور سے ہنسنے لگی۔

"او مسٹر شیخ! تم سمجھے نہیں۔ تم بڑے ڈرائی لوگ ہو۔ زندگی بڑی چارمنگ شے ہے۔ تم لوگ تجربوں میں یقین نہیں رکھتے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے تولیے کی گانٹھ ہاتھ سے پکڑ کے یوں کھینچی اور کہا:

"اپنے پسینے سے نہیں، اس گرم پانی سے غسل کیجئے۔"

پسینہ اور گرم پانی آپس میں مکس ہو گئے تھے۔ شاور کی پھوار جسم پہ پڑنے لگی اور اُس نے میرے جسم پر صابن ملنا شروع کیا۔ اُس کی اُنگلیوں کے مَس پہ پھوار کا گمان ہونے لگا۔ پانی اور انگلیوں کی پھوار آپس میں مکس ہو گئے۔ اُس نے

آہستہ آہستہ سارے جسم پر صابن مَلا اور پھر میرے بائیں بازو کو تھامتے ہوئے کہا:
میں تمہیں تھامے رکھتی ہوں اور تم کھڑے کھڑے شاور کے نیچے نہاتے رہو۔"
اب میرا جسم اُس کے دونوں ہاتھوں میں تھا۔ ایک عجب سکون اور کیف
کی بارش میرے سارے جسم پر ہونے لگی۔ بے شک کہ جسموں کے لمس میں جادو
ہے اور شفائی ہے۔

نہاتے نہاتے میں نے کہا "تم نے ایشیائی مرد کے بارے میں کچھ کہا تھا کہ
وہ مرض کی حالت میں بھی اپنے آپ کو مرد سمجھتا رہتا ہے۔"

"ہاں۔ یہ میرا مشاہدہ ہے۔ میں روزانہ کئی مریضوں کو غسل دیتی ہوں۔"

"لیکن آج سے اپنے مشاہدے میں ایک اضافہ کر لو۔"

"وہ کیا؟"

"وہ یہ کہ ایشائی مَرد کے لئے باتھ روم کے اندر تمہارے جیسی خوبصورت لڑکی
کو نرس سمجھنا اُس کے ذوقِ مردانگی کی توہین ہے۔" یہ سُنتے ہی اس نے شاور بند کر
دیا اور میرے جسم کو تولئے سے خشک کرتے ہوئے کہا۔ "کپڑے پہن لو اور اب میرے
ساتھ کمرے میں چلو۔ آج یہ غسل ایک نرس ہی نے دیا ہے۔"

میں نے کہا: "یہ اس طرح نہانا میری زندگی کا بہت بڑا واقعہ ہے۔"

اس نے پوچھا "وہ کیسے؟"

میں نے کہا۔ "وہ یوں کہ میری ماں کے بعد تم دوسری عورت ہو، جس نے مجھے
اس طرح نہلایا ہے۔" اس کنفیشن پر وہ کھِلکھلا کے ہنس پڑی۔

"مائی گوڈ۔ واقعی میں دوسری عورت ہوں؟ نو نو۔ میں اس پہ یقین نہیں
کرنا چاہتی" I PITY YOU, MR SHAIKH "یہ کہتے ہوئے اُس نے مجھے بستر پہ لٹا دیا
اور کہا کہ اب سو جاؤ اور "اچھے خوابوں" کی دعا دے کر وہ اُسی طرح مسکراتے

،جانے کمرے سے باہر چلی گئی جب وہ کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

کوئی چار روز بعد سرجن کمرے میں آیا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں چمک سی آگئی۔ اس نے میرا حال پوچھنے کے بعد کہا۔

"سرجری کے دوران تمہارا ریسپونس بہت اچھا تھا۔"

اِس جملے پہ مجھے سخت حیرت ہوئی میں نے کہا۔

"لیکن میں تو مرچکا تھا، تو میرا ریسپونس کیسا؟"

اس نے کہا "نہیں، تمہارے جسم نے عارضی موت کے خلاف بڑی مدافعت کی۔ تمہارا جسم موت کو قبول کرنے سے انکاری تھا۔ تم زندہ رہنا چاہتے تھے۔ اسی لئے اپریشن کامیاب ہوگیا۔"

میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ وہ خاموشی سے مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ مجھے دیکھ رہا تھا۔

"تم پہاڑ کی چوٹی کے کنارے پہ کھڑے تھے۔ ایک قدم اِدھر اُدھر، تمہیں موت کی گہری وادیوں میں لے جاتا۔"

"ڈاکٹر تو تم نے کیا کیا؟"

"میں نے موت کو بائی پاس کردیا۔ اب تمہیں دوبارہ زندگی مل گئی ہے۔"

میری آنکھیں اب بالکل اُمڈ پڑیں۔ دنیا میں آدمی ایک ہی بار تو آتا ہے۔ اس ایک زندگی میں موت کا وقفہ ذرا سی دیر کے لئے آیا تھا اُس کو "بائی پاس"، کرکے زندگی کا رشتہ پھر زندگی سے جوڑ دیا گیا۔ چند روز کی مہلت اور مل گئی۔ اب اس زندگی کی قدر کرو۔ یہ موت کا راستہ کاٹ کر تمہیں ملی ہے۔ اس کی قدر کرو، یہ بہت مہنگی ملی ہے۔

زندگی کی نعمت پاکر میں واپس گھر لوٹا، تو گھر میں قدم رکھتے ہی بڑے بھائی سے پوچھا کہ ماں کا کیا حال ہے۔

"اس نے بڑی آہستگی سے پوچھا: کیوں کیا بات ہے؟"

میں نے کہا کہ وہ تو وہاں ہسپتال میں اپریشن کے روز میرے ساتھ تھیں۔ پھر میں نے انہیں وہ سارا واقعہ سنایا کہ کس طرح اپریشن تھیٹر کا دروازہ آیا، تو وہ مجھے خدا حافظ کہہ کے چلی گئیں۔

جب میں نے یہ واقعہ سنایا، تو کیا دیکھتا ہوں کہ بڑے بھائی کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو گرنے لگے۔ روتی ہوئی آواز میں اس نے کہا۔

"برادر، وہ تمہیں خدا حافظ کہہ کے چلی گئیں۔ پھر واپس نہیں آئیں۔ میں وہیں بیٹھا بیٹھا پتھر ہو گیا۔

ماں واپس نہیں آئی؟ ماں واپس نہیں آئی؟" میں بلند آواز میں پکارنے لگا۔ میری آواز رندھ گئی تھی۔

"نہیں وہ تمہیں زندگی کے سپرد کر کے خود چلی گئیں۔ جس دن تمہارا اپریشن تھا، اس روز اچانک ان کی چھ برس کی بے ہوشی ختم ہو گئی اور وہ ہاتھ اٹھا کر تمہارے لئے دعائیں مانگنے لگ گئی تھیں۔ ہم حیران تھے کہ ان کو آج تمہاری کیسے خبر ہو گئی؟"

ساری رات میں گم صم پڑا لیٹا رہا۔" ماں نے یہ میرے ساتھ کیا کیا؟" میری غیر حاضری میں وہ مجھے بائی پاس کر گئی اور خود موت کی آغوش میں جا بیٹھی۔

زندگی کا تحفہ پہلی بار بھی اُسی نے دیا تھا اور یہ دوسری بار بھی اسی کی جانب سے تھا۔

قصّہ سوتے جاگتے کا

خواب کے عالم میں کیا دیکھتا ہے کہ وہ مقدّس مقامات کے سفر پہ روانہ ہے۔ راہ میں ایک بحرِ بیکراں ہے، جس کو وہ پاٹتا ہے، پھر خشکی آتی ہے، تو وہ اپنے آپ کو ایک صحرا کے سامنے کھڑا پاتا ہے۔ ریت ہی ریت۔ اس صحرا میں کبھی وہ پیدل چلتا ہے کبھی اونٹ پر سوار ہو جاتا ہے۔ کئی دنوں کے سفر کے بعد بالآخر اسے دُور سے منزل کے نشان نظر آنے لگتے ہیں۔ ایک مینار جو ایک مخروطی گنبد کے ساتھ کھڑا ہے، اس کا شوق مینار کو دیکھتے ہی تیز تر ہو جاتا ہے، وہ گرتا پڑتا جب اس مقام پر پہنچتا ہے، تو کیا دیکھتا ہے کہ اس عمارت میں ستون ہیں اور ستونوں کے درمیان ایک چار دیواری ہے۔ چار دیواری کے اُوپر گنبد ہے اور ستونوں کے اُوپر چھت۔ ستونوں کے درمیان چاروں اطراف سے راستے اس چار دیواری تک جاتے ہیں۔

وہ کمرے میں داخل ہوتا ہے، تو اسے وہاں کسی کے موجود ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ اچانک ایک جانب سے تیز روشنی کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ اس روشنی میں وہ ایک صورت دیکھتا ہے۔ لیکن وہ صورت نور میں اس طرح سے لپٹی ہوئی ہے کہ

اُس کے خدوخال اُسے دکھائی نہیں دیتے۔ بس اتنا یاد ہے کہ وہ نورانی صُورت اندر آئی، اُس کے چہرے کے گرد نُور کا ایک ہالہ ہے۔ جب اُس نے اس صورت کو قریب سے دیکھنے کی کوشش کی، تو اُس کی آنکھ کُھل گئی۔ عالمِ خواب سے وہ اَب عالم ہوش میں تھا۔ دیر تک لیٹا اس منظر میں ڈوبا رہا کہ اتنا طویل سفر کر کے وہ کس جگہ پہنچا تھا، ہونہ ہو یہ مقدس مقام وہی تھا، جس کا ذکر اُس کی نانی اس سے کیا کرتی تھی۔ وہ اُسے بچپنے میں اپنے سفر کا قصہ سنایا کرتی تھی۔ جب وہ ایک دُخانی جہاز میں سوار ہو کر ایک ریتیلے ساحل پر اُتری اور پھر اونٹوں کے ایک قافلے کے ساتھ شامل ہو کے ریتیلے صحراؤں میں کئی دن سفر کی حالت میں رہی۔ رات کو یہ قافلہ پڑاؤ کرتا تھا۔ رات کے اندھیرے میں راہزن ان پر حملہ آور ہوتے اور جو اثاثہ ان کے پاس ہوتا، اُسے لُوٹ کے لے جاتے مگر دوسرے روز ان کا سفر جاری رہتا۔ بھوک پیاس سے نڈھال ہو کر کئی مسافر جان سے چلے جاتے۔ جو بچ جاتے بالآخر منزل پہ پہنچ جاتے۔ یہ منزلِ عشق تھی کہ راستے کی کوئی مشکل اُن کے ارادوں کو متزلزل نہ کر پاتی۔ پھر نانی اماں اس گنبد والی عمارت کا ذکر کرتیں۔ اس ذکر میں ایک عجیب والہانہ پن ہوتا۔ اس عمارت والے کے ذکر پہ وہ جھومنے لگ جاتیں اور پھر اپنی لرزتی ہوئی آواز میں ایسے اشعار گا گا کے پڑھنے لگتیں، جن میں واری اور قربان ہو جانے کا ذکر ہوتا۔ یہ اشعار گاتے گاتے وہ جھُومنے لگتیں اور جھومتے جھومتے اُن پہ نشے کی سی کیفیت طاری ہو جاتی اور جب یہ کیفیت ان پہ طاری ہو جاتی، تو وہ وہاں سے چل دیتا۔

پھر جب اُسے نیند آتی، تو وہ خواب میں دیکھتا کہ اس سفر پہ وہ خود جا رہا ہے۔ بالکل اکیلا تن تنہا اور اسی عمارت کو دیکھتا ہے، جہاں نورانی صورت دکھائی دیتی ہے مگر اُس کے خدوخال واضح نہیں ہیں۔

یہ خواب اُس نے اپنی نیند میں کئی بار دیکھا۔ ایک مرتبہ تو اس نے دیکھا کہ وہ سمندر

میں ربڑ کی ایک ٹیوب پر جس میں ہوا بھری ہوئی ہے سوار ہے اور سمندر میں چلا جا رہا ہے۔ پھر وہی ریتلا ساحل آتا ہے اور وہ ٹیوب سے اُتر کر اونٹ پر سوار ہوتا ہے اور ایک مقام پہ پہنچتا ہے تو اُسے بتلایا جاتا ہے کہ جہاں وہ اس وقت موجود ہے یہ اللہ کا گھر ہے۔ اُسے دیکھتے ہی ایک ہیبت اُس پہ طاری ہوتی ہے اور وہ فوراً یہ خواہش کرتا ہے کہ میں اُسی مکان میں پہنچوں، جہاں روشنی دکھائی دیتی ہے اور ایک نورانی چہرہ ظاہر ہوتا ہے۔ مگر جس کے خدو خال واضح نہیں ہوتے۔ مگر اسی نُورانی صورت کی موجودگی میں اُسے ایک عجیب گہری طمانیت ملتی ہے اور اُسے یقین سا ہونے لگتا ہے کہ اُس نے جس مقام کے لئے سفر کیا تھا، اُس کی منزل یہی ہے۔ جیسے یہ مقامِ عشق ہے۔ پھر اس کی آنکھ کھل جاتی اور اسے افسوس ہوتا کہ آنکھ کیوں کھُل گئی ہے۔ جس لذّت سے وہ سرشار ہو رہا تھا، وہ لذّت تو اس کے خواب کے ساتھ ہی تھی۔ پہلی مرتبہ اُسے احساس ہوا کہ حقیقت تو بڑی گھناؤنی اور محدود سی کیفیت ہے، اِس میں تو تشنگیاں ہیں، حقیقت میں اگر خوابوں کی جگہ نہ ہوتی، تو حقیقت کس قدر بے وسعت اور بے رنگ ہوتی۔ خوابوں میں جذبوں کی تسکین تھی اور لامحدود وسعت۔ جس مقام پہ جانے کا اُس نے کبھی سوچا نہ تھا، خواب اسے ان مقامات پر لے گئے۔ اُس نے سوچا کہ خواب اس دنیا میں سب سے بڑی نعمت ہیں۔ دیکھنے کے لئے سونا بڑا ضروری ہے یہ غلط ہے کہ جو سوتا ہے وہ کھوتا ہے، اس نے جو بھی جاگ کر پایا تھا، وہ سو کر ہی پایا تھا۔

پھر وہ دن آیا، جب وہ ایک روز عالمِ ہوش میں اس مقام پر لایا گیا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے، یا ہوش میں ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے وہی مقدس مکان تھا اور سامنے جالی تھی۔ ستونوں کے اندر چار دیواری کو بڑی بڑی چادروں سے ڈھانپ دیا گیا تھا اور ستونوں کے گرد بھی جالیاں لگا کے اطراف کے تمام راستے بند کر دیئے تھے۔ خواب میں تو وہ چار دیواری کے اندر اپنے آپ کو

پاتا تھا مگر عالمِ ہوش کا منظر صرف اسی قدر مختلف تھا کہ وہ چار دیواری اور ستونوں کے باہر ایک جالی کے سامنے کھڑا تھا۔ جس کے تمام راستے اب بند کر دیئے تھے۔ باقی حقیقت وہی تھی، جسے وہ خوابوں میں دیکھ چکا تھا۔

اُس نے دیکھا کہ ستون بالکل وہی ہیں، اور ان کا رنگ بھی وہی گہرا زرد ہے، جو امتدادِ زمانہ سے سیاہ ہوگیا ہے۔ اُس نے دیکھا کہ اُس کا خواب اس کے سامنے ہے۔ مجسّم صورت میں حقیقت بن کر۔ اُسے یقین نہیں آرہا تھا کہ ایسا واقعی ہوگیا ہے۔ اس نے اپنے آپ کو یقین دلانے کے لئے اُس جالی کو چھونا چاہا، تو سامنے کھڑے ایک حاجب نے اُس کو ڈنڈے کے اشارے سے کہا کہ وہ جالی کو دیکھ سکتا ہے، پاس کھڑا ہو سکتا ہے مگر ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ لمس تو یقین کی پہلی منزل ہے۔ لمس کے بغیر اسے یوں لگ رہا تھا کہ نہیں یہ حقیقت نہیں، خواب ہی ہے۔ خواب میں بھی تو وہ بس دیکھتا ہی تھا اور یہاں بھی دیکھ ہی رہا ہے۔ اسے حاجب پہ سخت غصہ آیا، جو حقیقت اور خواب کے درمیان کھڑا ہوگیا تھا۔ یقین اور بے یقینی کے درمیان اس کا وجود نفرت کی دیوار کی طرح تھا مگر حقیقت تو گھناؤنی اور بے رنگ ہوتی ہے اور رنگ تو لمس کے بغیر پیدا نہیں ہوتا۔

لیکن وہ وہاں کھڑا تھا، جو اسے پہلے دکھا دیا گیا تھا۔ وہی نقشہ، وہی رنگ اس کے دل میں ویسی ہی طمانیت اُتر آئی تھی۔ جو خواب میں اسے اس مقام پہ پہنچ کر ہوتی تھی۔ سرشاری کی وہی کیفیت تھی، جو خواب میں تھی۔ اُس پہ آشکارا ہوا کہ اس کے خواب سچے تھے اور جس مقام پہ وہ اب کھڑا ہے یہ اُسے دکھا دیا گیا تھا۔ اس نے وہاں کی ہر چیز کو پہچان لیا تھا، جو پہلے خواب تھا اور اب حقیقت میں بدل دیا گیا تھا۔ جو اُس نے سوتے میں دیکھا تھا، اب جاگ کر دیکھ رہا تھا۔

اُس نے اپنے خوابوں کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ اُسے یاد آیا کہ اس

سے پہلے بھی ایک مرتبہ اسی طرح کا واقعہ اُس کے ساتھ گزر چکا ہے۔ اُسے یاد آیا کہ اُس نے ایک روز ایک شخص کو دیکھا اور اس کا دل ایک دم سے دھڑکا اور اُس نے خواہش کی کہ یہ شخص میری زندگی میں آجائے۔

اُس روز وہ سڑک پر سے گزر رہا تھا کہ اُس نے ایک حسین صورت کو سڑک کے کنارے کھڑے دیکھا۔ وہ صورت اس کے دل میں ایک دم اُتر گئی اور اُس نے خواہش کی کہ وہ اس کی زندگی کا حصہ بن جائے۔ وہ اُسے بالکل نہیں جانتا تھا۔ اس کا نام پتا کچھ بھی اسے معلوم نہ تھا۔ زندگی میں پہلی بار وہ صورت دکھائی دی اور پہلی بار اس نے خواہش کی کہ وہ صورت اس کی زندگی میں شریک ہو جائے۔ اس سارے عرصے میں وہ پھر دکھائی نہ دی۔ وہ خواہش جیسے کوئی خواب تھا، جو اُس نے دیکھا اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ ذہن کے پردے سے محو ہو گیا۔

سات برس گزر گئے اور ایک روز اُس نے کیا دیکھا کہ وہی مہ رُخ اس کی نگاہوں کے سامنے کھڑی ہے اور شریکِ زندگی بن گئی ہے۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ حقیقت ہے یا خواب۔ اُس نے اسے ہاتھ سے چھُوا۔ حقیقت اور خواب کے درمیان اب کے کوئی حاجب کھڑا نہیں تھا۔ لمس سے رنگ اُبھرے اور ان رنگوں کے درمیان اس نے دیکھا کہ سات برس برس پہلے اسے یہ مہ رُخ دکھا دی گئی تھی۔ جب وہ سڑک کے کنارے کھڑی تھی اور اسے دیکھتے ہی ایک خواہش نے جنم لیا تھا۔ پھر وہ خواہش خوابوں میں کہیں دَب گئی۔ وہ اس واقعہ کو بالکل بھول بھی گیا مگر اب سات برس بعد وہ جو ایک خواہش تھی۔ حقیقت بن کر آنکھوں کے سامنے تھی۔ اسے بڑی حیرت ہوئی کہ اُسے جو عطا ہوا ہے، وہ پہلے دکھا دیا گیا تھا۔ پتا چلا کہ چہرے، چیزیں اور جگہیں جو حقیقت بن کر سامنے آتی ہیں وہ اسے پہلے دکھا دی جاتی ہیں اور وہ جب حقیقت کی شکل میں انہیں دیکھتا ہے، تو اُس پہ یہ وا ہوتا ہے کہ یہ تو اُسے

پہلے دکھادی گئی تھی۔

اب جو اُس نے سوچنا شروع کیا، تو اُسے پتا چلا کہ یہ واقعہ تو اُس کے ساتھ مسلسل ہو رہا ہے، وہ جہاں کہیں بھی کسی ملک میں گیا اور وہاں کچھ برس قیام کیا، تو اُسے پتا چلا کہ جن جگہوں پہ لے جا کے اُسے بٹھایا گیا ہے" یہ تو وہی تھیں، جو یہاں آنے سے پہلے اُسے دکھادی گئی تھیں۔ اُسے یاد آیا کہ کئی برس ہوئے وہ یورپ کے اس ملک میں چند مہینوں کے لئے بھیجا گیا تھا۔ گھومتا گھامتا وہ اس کے دارالحکومت میں پہنچ گیا اور وہاں اپنے آپ کو ایک عمارت کے کمرے میں بیٹھا ہوا پایا۔ اس کمرے میں میز کے سامنے ایک کرسی تھی جو استعمال سے پرانی ہو چکی تھی۔ اُس کی نگاہیں اُس کرسی پہ آن کے رُک گئیں۔ پتا نہیں کیوں۔ اس کمرے میں اور بھی تین چار کرسیاں پڑی ہوئی تھیں، مگر یہ میز کے سامنے پڑی ہوئی کرسی اس کی نظروں میں اٹک گئی۔ اس نے کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی " الماریوں اور ان کے اندر رکھی ہوئی کتابوں کو دیکھا۔ زمین پر بچھے ہوئے میلے کچیلے قالین پر بھی اس کی نگاہ پڑی اور بائیں طرف شیشے کی دیوار کے پیچھے۔ خوبصورت چھوٹے چھوٹے گھر بھی اُسے نظر آئے وہ کچھ دیر اُس کمرے میں بیٹھا رہا اور پھر اُس کرسی پر جو اس کی نظروں میں اٹک گئی تھی وہ بیٹھے ہوئے شخص سے گفتگو کرتا رہا۔ سلسلۂ کلام جب ختم ہوا، تو وہاں سے اُٹھا اور چل دیا۔

اس واقعہ کے پورے نو برس بعد اُس نے دیکھا کہ وہ اسی کمرے میں اسی کرسی پر آن بیٹھا ہے، جو اس کی نظروں میں اٹک کے رہ گئی تھی۔ وہی کمرہ تھا، وہی کتابوں سے بھری الماریاں، وہی شیشے کی دیوار جس میں سے چھوٹے چھوٹے خوبصورت گھر دکھائی دے رہے تھے۔ اُسے یاد آیا کہ یہ جگہ جہاں اسے چند برس قیام کرنے کا حکم ملا ہے، یہاں تو وہ ایک روز آیا تھا اور اب کرسی پر بیٹھا ہوا ہے، جو اس کی نظروں میں اٹک گئی تھی۔ ایک ایک چیز اُسی جگہ پہ تھی، جو نو سال پہلے وہ کمرے میں دیکھ

چکا تھا۔ پھر پورے ساڑھے چار سال تک وہ روزانہ اُسی کرسی پر بیٹھا رہا۔ اس کا رزق اس عرصے کے لئے اُسی جگہ پہ لکھا گیا تھا۔

عجیب بات تھی وہ ایک دن جو نو برس پہلے اس کی زندگی میں آیا تھا، گزر گیا' اُسے وہ یاد بھی نہیں رہا تھا۔ درمیان میں نو برس جیسے وہ سویا رہا اور پھر ایک روز جو جاگا، تو اسی کمرے میں اسی کرسی پر اپنے آپ کو بیٹھے پایا۔ اُسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ جو نو برس پہلے دیکھا تھا، خواب تھا یا جواب دیکھ رہا ہے۔ خواب ہے' لیکن حقیقت یہی ہے کہ یہاں لانے سے پہلے اسے دکھا دیا گیا تھا کہ اسے ایک روز یہاں آنا ہے اور ساڑھے چار برس تک قیام کرنا ہے۔ گویا کچھ چیزیں اُسے سوتے میں دکھائی جاتی تھیں۔ کچھ جاگتے میں۔ پھر وہ چیزیں اس کی زندگی میں در آتی تھیں۔

جب ساڑھے چار برس بیتنے کو آرہے تھے، تو اس نے ایک خواب دیکھا کہ وہ سیاہی مائل پتھروں کی دیوار والی ایک عمارت میں داخل ہو رہا ہے۔ پتھروں کی یہ دیوار سبز پتوں اور پھولوں کی بیل سے ڈھکی ہوئی ہے اور بڑی خوبصورت ہے۔ بیلوں سے لدی ہوئی دیواروں اور مکانوں میں اُسے ہمیشہ بڑی کشش محسوس ہوتی۔ اس خوبصورت دیوار کے سائے میں اندر داخل ہونا اُسے بڑا اچھا لگا۔ دیوار کے اندر کیا دیکھتا ہے کہ نیلے گنبد کی محل نما ایک عمارت ایستادہ ہے جسے دیکھ کر وہ تھوڑی دیر کے لئے مبہوت ہو کے رہ گیا۔ یا اللہ یہ کوئی محل ہے یا قلعہ؟ سیڑھیاں چڑھ کر دروازے کے پاس پہنچا، تو اُسے محسوس ہوا کہ اُسے اندر آنے کے لئے کہا گیا ہے۔

اس خواب کے چند روز ہی بعد اُس نے اپنے آپ کو اُس محل نما قلعہ کے اندر پایا۔ اس کا رزق اب کچھ دیر کے لئے اس عمارت کے اندر تھا۔ یہ پہلی مرتبہ تھا کہ اسے پتا چلا کہ اُسے تو اس عمارت کی چار دیواری دکھا دی گئی تھی، جس کے اندر

وہ داخل ہو رہا ہے اور یہ کہ اس کا یہاں آنا کہیں اُوپر طے ہو چکا تھا۔ اُسے اب یقین آیا کہ اُس کا مقدّر ہی یہی ہے، اور اُوپر جو مشورے ہوتے ہیں، ان کے فیصلے سے اُسے آگاہ کر دیا جاتا ہے۔ کبھی سوتے میں کبھی جاگتے میں۔ یہ دکھانا دراصل بتلانا ہے۔ اگرچہ زبان یا آواز سے کچھ نہیں کہا جاتا۔ گویا جو دکھایا جاتا ہے، وہ برحق ہے اور وہ ایک دن ہو کے رہتا ہے۔

پھر اس نئے مقام پر اُس نے ایک نیا چہرہ دیکھا۔ اس چہرے میں عجب کشش تھی۔ دُھلا دُھلایا صاف شفاف اور روشن۔ اُسے دیکھتے ہی اس کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ ان آنکھوں میں جب اس نے جھانکا، تو اپنا ہی عکس دیکھا۔ اُسے ایسے لگا جیسے یہ چہرہ اس نے نہایت بچپنے میں دیکھا تھا جب وہ ابھی معصوم تھا اور شعور کو نہیں پہنچا تھا۔ اس چہرے میں اس نے اپنے لئے بلا کی کشش محسوس کی اور اُسے یک لخت اپنے سامنے پا کر اُسے لگا جیسے ایک چیز جو کہیں کھو گئی تھی، وہ اُسے دوبارہ مل گئی ہے۔ پھر اس چہرے میں اس نے اپنے لئے بھی اتنی ہی کشش دیکھی۔ یا اللہ یہ کیا ہو رہا ہے، کہیں بچھڑے ہوئے تو پھر ایک دوسرے سے نہیں مل رہے؟ اُس نے پھر پیچھے، بہت پیچھے مڑ کے دیکھا اور بچپن کو یاد کیا، تو اُسے اس چہرے کے سوا اور کوئی ایمیج دکھائی ہی نہیں دیتا تھا۔ بجز اُس کے جسے وہ اب اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہا تھا۔ یہ تو وہی چہرہ ہے وہی نین نقش، وہی کشش۔ کچھ لوگ اپنی جھلک دکھا کر پھر کہاں گم ہو جاتے ہیں؟ اور گم ہو جانے کے بعد وہ اچانک پھر واپس آجاتے ہیں، تو خوشی کے ساتھ ساتھ غم کی لکیریں بھی اُبھر آتی ہیں کہ یہ چہرے دکھائے گئے تھے تو اوجھل کیوں ہو گئے؟ پھر جب اُوجھل ہو گئے تھے، تو اب اتنی مدت گزرنے کے بعد اچانک کیوں ظاہر ہو گئے ہیں؟ یہ کیا ماجرا ہے؟ یہ کیسا پلان ہے؟ کوئی

پلان ہے بھی یا نہیں ؟ یا یہ واقعات و حادثات ہو رہے ہیں، انہیں اسی طرح ہی ہونا ہے۔ کوئی نہ کوئی سکیم پسِ پردہ ہے، جس کی کوئی منطق نہیں مگر پھر بھی ایک منطق ہے۔ کچھ عجب کھیل کرتار کے، میرے سائیں غریب نواز کے۔

وہ خواب سا چہرہ اپنی تمام ترکشش کے ساتھ اُسے کچھ دیر نظر آیا۔ یہ محبّت سے بھرا ہوا تھا اور اُسے دیکھ کر اس کا اِس دنیا میں زندہ رہنے کو جی چاہنے لگا۔ اُس کا جی چاہا کہ اس چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لے کر اس سے باتیں کرتا رہے۔ وہ اس خواب کو حقیقت میں بدلنا چاہتا تھا۔ اس نے کہا کہ پہلے تمام خواب حقیقتوں میں بدل دیئے گئے تھے۔ اِس خواب کو بھی وہ خواب نہیں رہنے دے گا، اسے بھی حقیقت کا روپ دے گا جو کچھ دیکھ رہا ہے، وہ جاگتے میں دیکھ رہا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی آنکھ لگ جائے اور وہ چہرہ غائب ہو جائے۔ اس نے پہلی بار یہ فیصلہ کیا کہ وہ اَب سوئے گا نہیں۔ وہ اگر سویا، تو وہ چہرہ ضرور نظروں سے اوجھل ہو جائے گا۔ پھر خواب میں بھی نظر نہ آئے گا۔ اُسے پہلی مرتبہ خواب پہ شک ہونے لگا۔ اُس نے سونے سے انکار کر دیا اور جاگتے ہی میں سب کچھ پانے کی خواہش کی ہوس خواہش پر وہ خوابوں سے محروم ہو گیا۔

پہلے جو کچھ اسے خوابوں کے راستے سے ملتا تھا، وہ دروازہ اب بند ہو گیا۔ وہ چہرہ جسے اسے اپنے ہاتھوں میں تھامے رکھنے کی تڑپ تھی، دیکھتے ہی دیکھتے خواب ہو گیا اور خواب اُس پہ اب بند ہو گئے تھے۔

کیا وہ چہرہ اَب اُس سے چھن گیا ہے، جسے جاگتے میں پانے کی اسے خواہش کی تھی ؟ وہ تو اب خوابوں میں بھی نہیں آتا۔ خوابوں میں وہ اب کیسے آتا، خواب تو اب اُس سے منہ موڑ گئے تھے۔

اس روز سے وہ حالت عذاب میں ہے۔ خواب اُس کی زندگی میں نہیں

رہے۔ چاروں طرف حقیقت ہی حقیقت ہے۔ گھناؤنی، کرخت اور ظالم۔ اس چہرے کے انتظار میں جاگ جاگ کر اس کی آنکھیں اینٹھ گئی ہیں اور وہ آدمی سے پتھر ہوتا جا رہا ہے۔ اُس کی ساکن اور پتھرائی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے لیکن تو اسے یہ کہتے سنائی دیتے ہیں کہ تم خوابوں میں زندہ رہتے ہو مگر زندگی خوابوں میں نہیں ہوتی۔

وہ یہ سب سُن کے چُپ رہتا ہے، پتھر بنا دیکھتا رہتا ہے۔ وہ انہیں کیسے کہے کہ خواب اگر زندگی میں نہ رہیں، تو پھر زندگی خالی ہو جاتی ہے، پتھر ہو جاتی ہے۔ خواب سے باہر زمین اور آسمان بھی پتھر کے ہوتے ہیں۔

اَب اُسے کوئی خواب نہیں آتا۔ اُسے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ اندھیرا ہی اندھیرا چاروں جانب ہے، اب اسے کچھ معلوم نہیں کہ آگے کیا ہوگا؟

اُس نے جو جاگ کر پایا تھا، اُسے خوابوں ہی میں ملا تھا۔ خواب رخصت ہوئے، تو دنیا عالم خالی ہو گئی۔

جس روز آدم کے جسم میں روح پھونکی گئی، تو اس نے آنے والے روز کا خواب دیکھا۔

جس دن سے خواب اُس سے روٹھ گئے ہیں اس سے اگلا دن اس پہ نہیں چڑھ رہا وقت رُک گیا ہے۔ زندگی میں حرکت نہیں رہی۔

تب سے وہ مسلسل جاگ رہا ہے اور اس کی آنکھیں اب بالکل پتھرا گئی ہیں، وہ سب خواب جو اُس نے پہلے دیکھے تھے۔ اَب پتھر بن گئے اور وہ چہرہ بھی اب پتھر بن گیا ہے، جو اُسے دکھایا گیا تھا اور جس میں اُس نے اپنے لئے بے پناہ کشش محسوس کی تھی۔ خواب اب اُس سے ہمیشہ کے لئے چھن گئے ہیں۔

بے جی

گھر میں سب انہیں بے جی کہتے تھے۔ یہ "بے جی" غالباً دیہات کی "بے بے جی" سے بنا ہوگا۔ جس میں "بے" کا ایک کیریکٹر شہر میں آتے آتے گر گیا۔ تہذیبیں جب اپنا اصل مسکن چھوڑ دیتی ہیں تو راستے میں اُن کا ایک نہ ایک کیریکٹر کہیں ضرور گر جاتا ہے اور ایک نیا کیریکٹر اُن میں داخل ہو کر اصل کا حُلیہ بالکل بگاڑ دیتا ہے۔
بے جی ایک ماں تھی۔ سیدھی سادی، نیک سیرت، خوش صورت، سراپا خلوص، سراپا محبت۔ شاید ساری دنیا کی مائیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ ان کا مقدر یہی ہے۔ وہ اس محبت میں اپنی زندگیاں بھی بے حقیر کر دیتی ہیں۔ اپنے لئے جینا حرام کر دیتی ہیں، ساری عمر صرف دوسروں کے لئے جیتی ہیں۔ ان کی اپنی کوئی زندگی نہیں ہوتی۔ پھر اک روز دوسروں کو سونپی ہوئی یہ زندگی بھی ان سے واپس لے لی جاتی ہے اور اس پہ بھی وہ شکر کا کلمہ پڑھتی ہوئی چپ چاپ دنیا سے چلی جاتی ہیں۔

جب وہ پیدا ہوا تو بے جی کے سینے پر ایک پھوڑا نکل آیا اور وہ بڑھ کر ساری چھاتی پہ پھیل گیا اور زہریلا مادہ اس میں سے رِسنے لگا تھا۔ ڈاکٹروں نے منع کر دیا کہ نوزائیدہ

کو چھاتی کا دُودھ نہ دیا جائے - اُسے بازاری دُودھ پہ ڈال دیا گیا۔ ماں کی نرم گرم چھاتی کے لمس اور اس کے دودھ سے وہ ہمیشہ کے لئے محروم ہو گیا - اِس محرومی نے اُس کے اندر ایک ایسی بھوک بیدار کر دی تھی کہ جب وہ بڑا ہو گیا تو ماں کو دیکھتے ہی اس کو بے اختیار گلے لگا کر اُس سے چمٹ جاتا اور وہ اسے کہتی بیٹا! اب بس کرو مگر وہ اُسے زور زور سے سینے سے بھینچتا اور کہتا ماں! جب تلک تمہارے سینے سے نہ لگوں مجھے یوں لگتا ہے کہ میں مکمل نہیں ہوں، میری کوئی چیز میری زندگی میں سے کم ہو گئی ہے۔ ماں کو رضائی میں لیٹے دیکھ کر وہ اُس کے ساتھ لحاف میں گھُس جاتا۔ ماں کہتی اب تو جوان ہو گیا ہے۔ داڑھی مونچھوں والا، تمہیں شرم نہیں آتی۔

وہ ماں کو سینے سے لگا کر کہتا: تم نے مجھے جنا ہے، مجھے تم سے شرم کیوں آئے؟ اس پر ماں ہنس دیتی اور کہتی کیا کروں جب تو پیدا ہوا تو میں تمہیں اپنا دودھ نہ پلا سکی، میں جانتی ہوں کہ میں تمہاری قصوروار ہوں۔

بے جی کی ذات گھر کا مرکز تھی۔ گھر میں جو کچھ ہوتا تھا اُس میں بے جی ہر جگہ نظر آتیں۔ صبح اُٹھتے ہی نماز کے بعد وہ دُودھ رِڑکنا شروع کر دیتیں۔ مٹّی کی چاٹی میں لکڑی کی مدا ہنی کے چلنے کی آواز سے سب بچے جاگ اُٹھتے اور اُٹھتے ساتھ ہی بے جی پیالے میں سفید مکھّن کا ایک بڑا سا پیڑا رکھے گڑوی میں لسّی ڈال کر سب کو پلاتیں۔ پھر مکھّن کو جمع کر کے اُس کا گھی بناتیں۔ سب کے لئے ناشتہ تیار کرتیں۔ باورچی خانے میں چولہے کے سامنے سب کو اپنے اِردگرد بٹھا کر انہیں مکھّن کے پراٹھے، دہی اور انڈے کھلاتیں۔ اُنہیں ناشتہ کرتے کبھی کسی نے نہ دیکھا تھا۔ سب اپنے اپنے سکول چلے جاتے اور جب گھر سے نکل رہے ہوتے تو دیکھتے کہ بے جی اُن کے ناشتے کے برتن دھو رہی ہوتیں۔

بے جی صبح سے شام تک کام میں جُتی رہتیں۔ بچوں کے کپڑے سینا، کپڑے

دھونے کا صابن تیار کرنا، سردیوں میں گندم میں سے نشاستہ نکال کر سُوجی کی پنیاں تیار کرنا، گھر میں چکی پر میدہ، بیسن اور جَو کا آٹا نکالنا، گھر کی صفائی کرنا، تینوں وقت سب کے لئے کھانا بنانا، گھر کی چھت پر تنور میں روٹیاں لگانا، ریٹھوں سے گرم کپڑے دھونا، اچار ڈالنا، سوّیاں بنانا، دانتوں کا منجن تیار کرنا، ہر رات کو سب کے بستر بچھانا اور پھر تھک ٹوٹ کر چارپائی پر گر جانا اور اگلی صبح پھر سب سے پہلے اندھیرے منہ اُٹھ جانا۔ بے جی صبح سے شام تک چکی کی طرح گھومتے رہتیں۔

اندھیرے منہ کمرے میں ان کے مناجات پڑھنے کی آواز آتی۔

تری ذات ہے اکبری سروری میری بار کیوں دیر اتنی کری

یہ مناجات ختم ہوتی تو پھر ؏

میاں موج دا دریا کھول رحم دی گلی، کا وِرد شروع ہو جاتا۔ یہ مناجات بڑی شیریں آواز میں وہ پڑھتیں مگر ان کے لہجے میں بڑی لجاجت ہوتی۔ جیسے وہ اللہ تعالیٰ کے رُو برو کھڑے ہو کر اُن سے رحم، کرم اور بخشش مانگ رہی ہیں۔ بے جی کے لہجے سے اللہ کی جو تصویر ذہن میں بنتی تھی وہ رحیم، کریم اور مہربان کی تھی مگر بعد میں مسجد کے مُلّا نے اس تصویر میں دہشت کا ایسا رنگ بھر دیا کہ اللہ کے نام ہی سے جسم میں خوف اور کپکپی طاری ہونے لگتی۔ جو اللہ تعالیٰ مُلّا نے دکھلایا وہ صرف جبار، قہار اور جلالی صفات کا مالک تھا جو اس انتظار میں بیٹھا رہتا ہے کہ ادھر اس کا گناہ گار بندہ آئے، ادھر وہ گُرزیں مار مار کے اُس کے فیتے فیتے کر دے اور پھر اُسے نارِ جہنم میں پھینک دے۔ بے جی کا خدا تو بڑا شفقت والا اور محبت کرنے والا تھا۔ کبھی کبھی تو لگتا کہ وہ بے جی کا دوست ہے وہ اندھیرے منہ جس پیار سے مناجات پڑھتیں اور بعد میں جب دعا مانگنے لگتیں تو ایسا معلوم ہوتا کہ وہ کسی دوست سے باتیں کر رہی ہیں۔

بے جی گھر سے بالکل باہر نہیں نکلتی تھیں۔ سوائے کسی خوشی یا غم کے موقع پر جب وہ نہا دھو کر صاف کپڑے پہنتیں اور سفید لٹھے کا برقعہ پہن کر گھر سے نکلتیں۔ گھر کی چار دیواری میں وہ معمولی کپڑوں ہی میں دکھائی دیتیں جنہیں دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ یہ مزدوری کرنے والی کوئی عورت ہے جسے نہ کپڑوں کا کوئی ہوش ہے نہ اپنے جسم کا اور سچ بات بھی یہی ہے کہ بے جی ایک مزدور ہی تھیں جو اپنے شوہر اور بچوں کی دن رات خدمت کرتے کرتے ایک روز سفید لٹھے کے برقعے ہی میں اگلے جہان چلی گئیں۔ اس مزدوری کے علاوہ انہوں نے اِس دنیا میں اور کچھ نہ دیکھا۔

اُن کی ملنے والیوں میں بھی ایسی ہی عورتیں تھیں جو انہیں اللہ کے قریب لگتیں۔ ایک مائی حاجن تھی جو گاؤں سے انہیں ملنے آتی اور اپنے ساتھ گنے اور مکئی کی روٹیاں لاتی۔ مائی حاجن بڑے رنگ روپ والی تھی اور بے جی کا کہنا تھا کہ یہ نُور اس کے چہرے میں اللہ کی قربت سے آیا ہے اور وہ اللہ کے گھر اور مدینے کی گلیوں میں سے ہو کے آئی ہے اور اس بنا پہ وہ دنیا کی تمام مخلوق سے افضل ہے۔ اللہ کے گھر کی زیارت اور مدینے میں پیارے رسولؐ کے روضے پہ حاضری بے جی کی زندگی کا سب سے خوبصورت خواب تھا اور یہ خواب وہ سوتے جاگتے ہر وقت دیکھتی رہتیں۔

پھر ایک دن ان کی زندگی میں آیا کہ اپنے شوہر کی وفات کے کئی برس بعد ان کے بچوں نے انہیں سفرِ حج پہ روانہ کیا۔ بے جی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے عمر بھر کے خواب کو اپنی ناپائیدار زندگی میں دیکھنے والی ہیں۔ روانہ ہوتے وقت ان کے حواس ان کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ یقین اور بے یقینی کے درمیان بے جی لٹک رہی تھیں اور ان کی ایکسائیٹ منٹ اس قدر بڑھ گئی کہ انہیں ریل گاڑی ہی میں پھونک کے بخار چڑھ گیا اور بلڈ پریشر بڑھ گیا۔ وہ شدید نروس ہو گئیں۔ عمر بھر جس دن کا انہیں انتظار تھا اور جس کے لئے برسوں دن رات وہ دعائیں مانگتی رہتی تھیں،

وہ دن آگیا تھا، مگر اُس دن کو دیکھنے کی ہمّت بے جی کو نہیں ہو رہی تھی۔ "نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ میرے جیسے گناہ گار کو وہاں کیسے بلایا جا سکتا ہے؟" اِسی سوچ میں غلطاں و پیچاں، وہ پھٹی پھٹی آنکھوں اور زرد چہرے کے ساتھ پانی کے جہاز پر سوار ہو گئیں۔ اُن کی یہ حالت دیکھ کر پیچھے سب یہ دعا مانگ رہے تھے کہ زندہ سلامت خیریت سے واپس آجائیں۔

بے جی کی قوّتِ مشاہدہ اور یاد داشت حیرت ناک حد تک تیز تھی۔ ملکہ وکٹوریہ کے دورِ حکومت میں انہوں نے مِشن سکول سے آٹھ جماعتیں پڑھی تھیں اور اپنے سکول کی ٹیچرز کے حُلیے، لباس اور عادات کے علاوہ انہیں ہر کلاس کا کورس پُوری طرح از بر تھا۔ جو نظمیں اُس زمانے میں پڑھ رکھی تھیں، وہ اُسی طرح ذہن میں تازہ تھیں اور پھر اس کے ساتھ ساتھ فارسی، اُردو اور پنجابی کے کئی اشعار اور قصّے اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ زبان پہ جاری رہتے تھے۔ جو دیکھتی اور سنتی تھیں اُن کے ذہن کے ٹیپ پہ اسی طرح ریکارڈ ہو جاتا اور پھر انہیں اِس ٹیپ کو چلانے کیلئے بس ایک بٹن ہی دبانا پڑتا تھا اور پھر گھنٹوں تصویری امیجز کے ساتھ ساتھ ساؤنڈ ٹریک بھی چلتا رہتا۔ حیرت ہوتی تھی کہ کوئی معمولی سے معمولی تفصیل بھی اس واقع کی نہ چھوٹتی۔ ذہن میں تصویر اور آواز کے خاکے جُوں کے توں محفوظ تھے۔

حج سے جب واپس آئیں تو وہاں کے قِصّے ایک عجیب لذّت کے ساتھ بیان کرتیں۔ ان کے بیان اور لہجے سے محسوس ہوتا کہ یہ تمام واقعات آسمانوں کے ہیں اور وہ زمین سے آسمان پر گئی تھیں جہاں پہ تمام واردات ان کے ساتھ ہوئیں۔ عزیز رشتہ دار اور لوگوں سے ملنے کے بعد انہوں نے اپنے بچوں کو سفرِ حج کی رُوئیداد سُنانا شروع کی۔ پانی کا جہاز کراچی سے چلا، پہلے جہاز کا بیان شروع ہوا، پھر جہاز کے عملے کی تفصیل، کھانے کی تفاصیل، کھُلے سمندر میں جہاز کا داخل ہونا، مختلف النوع

مچھلیوں کا جہاز کے اِرد گرد اُچھلنا، تیز ہوا کا چلنا اور اس سے لہروں میں تلاطم پیدا ہونا اور پھر جہاز کا ڈولنا اور جہاز میں افراتفری کا منظر اور لوگوں کی طبیعت پہ اُس کے اثرات۔ صبح کے دو بج گئے اور جہاز کہیں رُکنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ آخر ان کے ایک بیٹے نے اُباسی لیتے ہوئے کہا "بے جی، اب جدّے اُتر بھی جاؤ، ابھی تو خانہ کعبہ اور روضۂ رسولؐ پہ بھی تو پہنچنا ہے۔"

بے جی اتنی جلدی جدّے کہاں اُترنے والی تھیں۔ کہا کہ تھک گئے ہو تو سو جاؤ۔ زندگی رہی تو باقی کل سہی اور تمام اہلِ خانہ نیند کی لہروں میں ڈولتے ہوئے وہیں فرش پہ چت ہو گئے اور گہری نیند میں ڈوب گئے۔ بے جی کا جہاز ابھی سمندر میں رواں دواں تھا۔

نماز، روزے، وظیفے اور عبادات کے باوجود بے جی اپنے آپ کو اس دنیا میں بہت غیر محفوظ سمجھتی تھیں۔ ان کے پہلے دونوں بیٹے بچپن ہی میں مر گئے تھے۔ ایک پر چولہے پہ رکھا ہوا گرم پانی کا دیگچہ اُلٹ گیا تھا، دوسرے کے بارے میں وہ بتلاتی تھیں کہ ایک فقیر دروازے پہ آیا اور یہ بچہ بھاگا بھاگا باہر اُس کی آواز سن کر اُسے دیکھنے کے لئے گیا۔ اس فقیر نے بچے کا کلیجہ نکال دیا۔ جب وہ اندر واپس لوٹا تو وہ خون کی قے کر رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے ہاتھوں میں سے نکل گیا۔ اِس کے بعد ان کے یہاں بیٹیاں پیدا ہونے لگیں اور بے جی پیروں فقیروں کے پاس دعا کیلئے حاضر ہوتیں کہ اللہ انہیں بیٹا دے۔ اللہ نے ان کی سُن لی اور پھر یکے بعد دیگرے چار بیٹے ان کے یہاں ہوتے۔ اِن بچوں کو دیکھ دیکھ کے وہ خوش ہوتیں مگر اس خوشی میں ہر وقت ڈر بھی شامل ہوتا کہ کہیں انہیں کسی کی نظر نہ لگ جائے۔ چاروں کو اکٹھے ایک ہی وقت میں باہر نہ نکلنے دیتیں۔ چاروں اکٹھے چلیں گے تو دیکھنے والوں کی نظریں انہیں کھا جائیں گی۔ انہیں کچھ ہو جائے گا۔ یہ خوف اِس قدر بڑھ گیا کہ بے جی پہ توہمات

کا ایک سایہ سا چھا گیا۔ منگل کو سفر پہ نہیں جانا، کھیرا کھانے کے بعد پانی نہیں پینا، یہ بادی ہے وہ بادی ہے۔ اس کے کھانے سے پیٹ خراب ہو جائے گا۔ زیادہ ہنسنا نہیں۔ زیادہ ہنسنے کے بعد پھر رونا پڑتا ہے۔ لہٰذا رونے سے بچنے کے لئے بہتر ہے کہ ضرورت سے زیادہ ہنسا ہی نہ جائے۔ سکھوں اور مسرتوں سے بے جی کو بہت ڈر لگتا تھا۔ اُن کے یہ خوف اور وہم آہستہ آہستہ اُن کی اولاد میں بھی سرایت کر گئے۔ جسے دیکھو اُس کا پیٹ کچھ نہ کچھ کھانے سے اُلٹنے لگا۔ یہ کھایا تھا، موافق نہیں آیا، وہ کھایا تھا مگر ذرا زیادہ کھا لیا۔ بے جی کا غیر محفوظ ذہن اب تمام بچوں میں بٹ گیا تھا۔ جسم کے گرم سرد ہو جانے کا خوف، ایئر کنڈیشنرز کا خوف، کمرے کے اندر بجلی کے پنکھے کی ہوا میں سونے کا خوف، برف کے ٹھنڈے پانی کا خوف، گرم چائے اور کافی کا خوف، گائے کے گوشت کا خوف، ان خوفوں سے سارا گھر ذہنی طور پہ میں نیوراٹک ہو گیا اور سب یہی سمجھتے تھے کہ یہ تمام چیزیں نقصان دہ ہیں اور ان کی طرح دوسرے تمام لوگوں کے لئے بھی مُضر ہیں۔ لہٰذا اس گھر کا ہر فرد ان تمام چیزوں کے مُضر اثرات پہ دوسروں کو لیکچر دینا بھی ضروری سمجھتا جس طرح تبلیغی جماعت والے بات بات میں اسلام کو لے آتے ہیں۔

بے جی کے تحفظ کا آخری سہارا اُن کا شوہر جس دن اللہ کو پیارا ہو گیا تو بے جی اس دنیا میں بالکل غیر محفوظ ہو گئیں۔ انہیں یوں محسوس ہوا کہ وہ تخت جس پہ وہ بیٹھی ہوئی تھیں وہ ان کے نیچے سے کھسک گیا ہے اور وہ دھڑم سے زمین پر آ گری ہیں۔ اُن کے سر پہ سے تاج اُتر گیا ہے اور اُن کا سر ننگا ہو گیا۔ شوہر کی موت کے سامنے ہر چیز جیسے تیز آندھی میں اُڑ گئی۔ اُن کا یقین ہر شے پہ ڈول گیا۔ نماز، روزے، وظیفے اور مناجات سب برابر جاری تھے مگر اب انہیں کسی چیز سے قوت حاصل نہ ہوتی۔ بیٹوں کے گھر جانے سے ہچکچاتیں کہ اپنا گھر چھوڑ کے کہیں اُن کے اور اُن کی

بیویوں کے دستِ نگر نہ ہو جائیں - اپنے شوہر کے گھر رُوکھی سُوکھی، جیسی تیسی بھی ملے وہ اس سے کہیں بہتر ہے - بیٹوں کے گھر جاتیں مگر دل ان کا وہیں اپنے شوہر کے گھر ہی میں اٹکا رہتا - شوہر کی موت کو انہوں نے ذہنی طور پر ایک دن کے لئے بھی قبول نہ کیا - انہیں یہ خوف لاحق رہتا کہ جس روز وہ یہ تسلیم کریں گی، اس روز وہ اپاہج ہو جائیں گی اور اپنی اولاد کی ہمیشہ کے لئے محتاج ہو جائیں گی اور یہ انہیں جیتے جی کسی صورت گوارا نہ تھا - مگر حقیقت اب بدل گئی تھی جسے وہ قبول کرنے کو تیار نہ تھیں دراصل بے جی کے ساتھ خرابی یہیں سے شروع ہو گئی تھی -

اب وہ اکیلے رہنے لگی تھیں اور اندر سے بھی تنہا ہو گئی تھیں - بات چیت کا لہجہ بھی ایسا تھا جیسے وہ حالتِ سوگ میں ہوں - کسی خوشی میں کھل کے شریک نہ ہوتیں - اپنے آپ میں لئے دیئے رہتیں - پھر آہستہ آہستہ وہ اپنے ماحول سے کٹنا شروع ہو گئیں -

بے جی جو صبح سے شام تک چکی کی طرح مصروف رہتی تھیں اب بالکل فارغ ہو گئیں - چارپائی پہ بیٹھے تسبیح کے دانے گھماتی رہتیں اور مناجات بھی پڑھتی رہتیں مگر زیادہ تر چپ رہتیں - کہاں وہ وقت کہ وہ تفصیلات وجزئیات میں ڈوب کر واقعات وشخصیات کی منظرکشی میں ہر وقت بولتی رہتی تھیں اور کہاں اب یہ کہ گوشے میں بیٹھے ہوئے چپ چاپ تسبیح پھیرتی رہتیں - تسبیح کے دانوں کے ساتھ ساتھ اب انہوں نے اپنی ٹھوڑی کو کھجلانا بھی شروع کر دیا اور دیکھتے دیکھتے یہ ہو گیا کہ زیادہ کھجلانے سے ٹھوڑی سیاہ ہونے لگی - بے جی کو وہم ہو گیا کہ اُن کی شکل بگڑنے لگی ہے - اُٹھتے بیٹھتے کہنے لگیں کہ میرے ڈاڑھی نکل آئی ہے - آئینہ دیکھنے سے نفرت ہو گئی - اب ہر وقت ٹھوڑی کھجلاتی رہتیں اور اس خوف کا اظہار کرتیں کہ چہرے پہ ڈاڑھی نکل آئی ہے اور شکل سے بے شکل ہو گئی ہیں - بہت سے حکیموں ڈاکٹروں کو دکھلایا سب کا خیال یہ تھا کہ الرجی ہے - الرجی کی دوائیاں اور پڑیاں سینکڑوں کی تعداد

میں ختم کیں مگر کھجلی میں کوئی کمی نہ ہوئی اور یہ خوف کہ صورت بگڑ گئی ہے اور بھی بڑھ گیا۔
طبیعت میں بے چینی زیادہ ہوگئی، اب انہوں نے دوسروں سے باتیں کرنا بھی چھوڑ دیں،
بس اپنے آپ سے باتیں کرنے لگ گئیں۔ مکالمہ ختم ہوگیا، خود کلامی شروع ہو گئی۔
دوسروں کے وجود کا شعور کم ہونے لگا۔ ارد گرد بیٹھے ہوئے افراد اُن کے لئے مٹی کے
بُت بن گئے۔ خود کلامی بڑھی تو ہاتھ کے اشاروں سے اپنے آپ سے مخاطب ہونے
لگیں۔ معلوم ہوا کہ باہر کا ماحول اُن کے لئے خواب بن گیا ہے اور وہ اپنے اندر بہت دور
چلی گئی ہیں، اتنی دور کہ اب جس دنیا میں رہنے لگیں۔ وہ ان کا ماضی تھا اور
یہ ماضی ہی اب ان کے لئے زندہ حقیقت تھا۔ جو موجود تھا اور
سامنے تھا، وہ اب خواب تھا، فریب تھا اور جھوٹ تھا۔ وہ زمانہ حال سے مکمل طور پر
کٹ گئیں اور موجود ان کے لئے بے حقیقت ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی موجود میں جو کچھ
تھا وہ بھی بدل گیا۔ اپنے بیٹے بیٹیوں کو یاد کرتی تھیں اور اُن سے ملنے کے لئے تڑپتی
تھیں، سب بچے اب ماضی کا حصّہ بن چکے تھے۔ وہ ان کے سامنے بیٹھے ہوئے اُنہیں کہتے
کہ ہم تو آپ کے سامنے موجود ہیں اور اپنا نام لے کے بتلاتے کہ انہیں پہچان ہو، مگر جب
وہ انہیں اپنے نام بتلاتے تو بے جی طیش میں آجاتیں اور کہتیں کہ نہیں تم جھوٹے ہو،
تم وہ نہیں ہو، تم میرے بچے نہیں ہو، وہ تو سب مر گئے ہیں، تم نے تو مجھے گرفتار کر
رکھا ہے، قید کر رکھا ہے، مجھے اپنے بچّوں سے دُور کر دیا ہے۔ تم ظالم ہو۔ تم دُشمن
ہو۔ پھر چیخنے چلاّنے لگتیں اور دھاڑیں مار مار کے رونے لگتیں۔ شام کے وقت باہر
صحن میں آن کے بیٹھ جاتیں اور ایک ایک بچّے کا نام لے کر اُن سے باتیں کرنے لگ
جاتیں انہیں حاضر کر لیتیں اور ان سے مکالمے کرتیں پھر رونا اور چیخنا شروع کر دیتیں
کہ یہ سب کہاں چلے گئے۔ بے جی کی یہ حالت دیکھ کر اُن میں سے جب کوئی بول
پڑتا اور انہیں کہتا، آپ ابھی مجھے پکار رہی تھیں، میں آپ کے پاس آگیا ہوں تو پھر

انہیں بولنے والے پہ غصہ آجاتا۔ یہ غصہ آہستہ آہستہ بڑھنے لگا اور اب جسے وہ یاد کر رہی ہوتیں وہ اگر انہیں اپنے ہونے کا یقین دلانے کی کوشش کرنے لگتا تو وہ اُسے مارنے کو دوڑتیں۔ جو شے ہاتھ میں آتی اس پہ دے مارتیں، اُس کا گلا دبانے کی کوشش کرتیں۔

بے جی جو اپنی اولاد کو دیکھ دیکھ کے جیتی تھیں اور بات بات پہ انہیں دعائیں دیتی تھیں اب وہ اولاد اُنہیں ہاتھ نہیں لگا سکتی تھی۔ وہ کسی کو چھونے نہیں دیتی تھیں۔ بیٹوں میں سے اگر کوئی ان کے پاؤں پکڑتا یا سر دبانے کی کوشش کرتا تو وہ فوراً بول اُٹھتیں۔ "یہ غیر محرم کا ہاتھ ہے۔ مجھے چھُونے کی کوشش مت کرو۔ جلد ہی یہ حالت ہو گئی کہ کوئی بیٹا ان کے کمرے میں داخل ہوتا تو وہ پوچھتی کون ہے؟ وہ اس ڈر سے اپنا نام نہ بتلاتا کہ اصل نام سُنتے ہی ان کو طیش آجائے گا۔ بس چُپ کھڑا رہتا مگر وہ فوراً اسے کمرے سے نکلنے کا حکم دیتیں کہ غیر محرم مرد کا اُس کمرے میں کوئی کام نہیں۔ بیٹے اب غیر محرم ہو گئے اور بیٹیاں دشمن اور چڑیلیں جنہوں نے بے جی کو قید کر رکھا تھا۔

جب ماضی ہی حقیقت رہ گیا اور حال سے رشتہ مکمل طور پہ کٹ گیا تو ان کی زبان بھی بدل گئی۔ پنجابی بولتے بولتے وہ اب اُردو میں گفتگو کرنے لگیں اور اُردو بھی بڑی مُفرّس اور معرّب جو انہوں نے ملکہ وکٹوریہ کے زمانے میں اس وقت پڑھ رکھی تھی۔ جب اُنہیں کپڑوں کی ضرورت ہوتی تو وہ کہتیں، "ہے لڑکیو! میرے پارچات کہاں ہیں؟" اتنی ٹھیٹھ پنجابی بولنے والے بے جی کے منہ سے اب اتنی بنی سنور ار دو سن کر بڑا دُکھ ہوتا کہ وہ اپنے اصل سے کتنی دُور چلی گئی ہیں۔ اب جو زبان وہ بول رہی تھیں وہ ان کی شخصیت سے اس قدر مختلف تھی کہ لگتا بے جی کوئی ماسک پہن کر اُس کے پیچھے سے بول رہی ہیں۔ جی چاہتا کہ آگے بڑھ کر اِس ماسک کو چہرے سے اُتار پھینکیں۔ مگر کون آگے بڑھتا اور نہ ہاتھ ان کے چہرے کے قریب لاتا۔ یہ سب ہاتھ غیر محرم ہاتھ بن چکے تھے

اور ماسک کے پیچھے جو چہرہ تھا وہ اب بے جی کی نظر میں بدصورت ہو چکا تھا جسے وہ کسی کو دکھانا نہیں چاہتی تھیں۔

جو بیٹیاں ان کی خدمت کیلئے ان کے پاس موجود رہتیں اُن کے نام بھی انہوں نے بدل دیئے تھے۔ کوئی زینب تھی، کوئی عائشہ اور کوئی فاطمہ۔ انہیں ناموں سے انہیں پکارتیں۔ بیٹوں میں سے اگر کوئی کہتا کہ میں زینب یا عائشہ کا بھائی ہوں تو اسے کمرے میں بیٹھنے پر کچھ دیر اجازت مل جاتی۔ زینب، عائشہ اور فاطمہ کے نام اب واحد پاسپورٹ تھے جن کے ذریعے سے بے جی تک پہنچا جا سکتا تھا۔ ورنہ وہ کسی اور نام والے کو اپنے قریب نہ پھٹکنے دیتیں۔

نام اور زبان بدل گئے، زمانہ حال کی کوئی شے باقی نہ رہی مگر مناجات میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ روزانہ صبح اسی طرح اپنی آواز میں ترنم کے ساتھ "میری بار کیوں دیر اتنی کری" کا ورد شروع ہوتا۔ پھر "جل توں جلال توں۔ آئی بلا ٹال توں" کا ذکر شروع ہوتا۔ مگر وہ بلا جو آگئی تھی اب نکلنے سے انکاری تھی۔ بے جی زندہ تھیں مگر ماضی میں، زمانۂ حال میں رہنے والوں کے لئے وہ اِس دنیا سے جا چکی تھیں۔ اب ان کی واپسی ناممکن ہو گئی تھی۔ اُن کے سانس کی دھونکنی بھی چل رہی تھی، ان کی آواز بھی سنائی دیتی تھی، مناجات میں لجاجت کا لہجہ بھی وہی تھا، بیٹوں بیٹیوں کو اُسی محبت سے رو کے پکارتی تھیں جو محبت انہیں اپنی اولاد سے تھی مگر بے جی اب وہاں موجود نہیں تھیں، وہ ماضی میں سفر کر گئی تھیں، آنکھیں تھیں مگر سامنے کی چیزوں اور شکلوں کو پہچانتی نہ تھیں، ہاتھ پاؤں اور جسم بھی تھا مگر وہ جو اس کے اردگرد تھے اُن کے لمس سے محروم ہو گئے تھے۔ نہ وہ کسی کو گلے لگا سکتی تھیں نہ انہیں گلے لگانے کے لئے ترسنے والے انہیں اپنے سینے سے لگا سکتے تھے۔ دُوری اور فاصلے اب بے جی اور اُن کے پیاروں کے درمیان تلوار بن کر تن گئے تھے۔ بے جی اب خواب میں بدل گئی تھیں اور بیتے بے جی

کے لئے فریب میں ڈھل گئے تھے۔

پھر اک روز بے جی نے غلیظ گالیاں دینا شروع کر دیں۔ اُن کی زبان سے گالیاں سُن کر اس سے بھی زیادہ صدمہ ہوا جس روز انہوں نے مُقدّس اُردو بولنا شروع کر دی تھی۔ بے جی کی زبان سے مناجات اور دعاؤں کے علاوہ تو کوئی لفظ کسی نے نہ سُنا تھا۔ اب جو تواتر سے گالیاں برسنے لگیں تو سبھی حیرت زدہ رہ گئے کہ بے جی کو یہ کیا ہوگیا ہے۔

ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ بے جی کی یادداشت بالکل جواب دے چکی ہے اب وہ اس زمانے میں نہیں رہتیں۔

اِسی عالم میں چھ برس گزر گئے اور آہستہ آہستہ وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئیں۔ ہوش جاتے رہے، حال کے ساتھ اب ماضی بھی دھند میں دفن ہونے لگا۔

جب وہ ہوش میں تھیں تو ایک جادو بیان مُقرّر کا ذکر کیا کرتیں کہ وہ جب تقریر کرتا تو اُس کی شیرینیٔ زُبان پہ لوگ مر مٹتے۔ وہ جب چاہتا انہیں ہنسانے لگتا اور جب چاہتا انہیں رُلانے لگتا۔ اُسے زبان پہ اِس قدر قدرت حاصل تھی۔ پھر زندگی کے آخر میں اس پہ فالج کا ایسا حملہ ہوا کہ زبان بالکل بند ہوگئی۔ پھر کہا کرتے کہ خدا کسی سے وہ چیز نہ چھین لے جو اُس کی پہچان ہو۔ بے جی کی پہچان ان کی قوتِ مشاہدہ اور حافظہ تھی۔ وہ جو دیکھ لیتی تھیں۔ اسے کبھی بھولتی ہی نہیں تھیں۔ اب جو آنکھوں کے سامنے تھا اسے بھی نہ پہچان سکتی تھیں۔

ایک عجیب ناقابلِ یقین صورتِ حال گھر میں پیدا ہوگئی تھی جو مہینوں اور سالوں پہ پھیل گئی تھی۔ بے جی کا سانس لیتا ہوا جسم سب کو دکھائی دیتا تھا مگر اس جسم میں اب بے جی موجود نہ تھیں۔ ان کا سب کو گلے لگانے والا سینہ بھی سانس کے ساتھ پھولتا اور سُکڑتا تھا مگر اس سینے کے اندر دوسروں کو گلے لگانے والی تڑپ اب ختم ہو چکی تھی۔ اُن کی بڑی بڑی غلافی آنکھیں اُسی طرح کُھلی تھیں مگر ان آنکھوں

میں کسی کو دیکھ کر کوئی حرکت پیدا نہ ہوتی تھی - بے جی کا بُت تو موجود تھا مگر بے جی
اِس دنیا سے جا چکی تھیں -

جب ان کے بچوں نے دیکھا کہ بے جی کی بجائے اب صرف ہاتھ، پاؤں اور
خالی جسم ہی رہ گیا ہے اور اس جسم کے اندر بے جی کا کہیں کوئی سراغ نہیں ملتا تو انہوں
نے ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر دعا کر مانگنا شروع کر دی کہ اے خدا بے جی کی مشکل آسان کر -

وہ یہ دُعا مانگنے میں سچے تھے کہ جسم جب رُوح سے خالی ہو جائے تو وہ زمین پر
صرف بوجھ بن کے رہ جاتا ہے -

وہ بچے جن کی درازیٔ عمر کی دعائیں بے جی مناجات کے وقت مانگا کرتے
تھے اب وہ بچے بے جی کو صرف جسم کی صورت میں دیکھ نہ سکتے تھے اور دُعا کرتے
تھے کہ بے جی کی یہ مشکل کسی طرح آسان ہو -

بے جی تو ایک مدت سے اِس دنیا سے جا چکی تھیں، خالی خولی جسم سِسک سِسک
کے مُرجھا رہا تھا، پھر اِک روز اس جسم کا پانی بھی بالکل خشک ہو گیا اور وہ مُردہ ہو گیا -
بے جی کے جانے کے بعد یہ بھی زیادہ دیر زندہ نہ رہ سکا - اُس دن گھر میں سب لوگ بے جی
کو یاد کر کے بہت روئے -

سب ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے کہ بے جی نے ایک دن جانا تو تھا ہی
مگر وہ مرنے سے پہلے ہی سب سے روٹھ کے کیوں چلی گئیں ؟

اور وہ جسے پیدا ہوتے ہی بے جی اپنی چھاتی سے نہ لگا سکیں ، مرتے وقت بھی
وہ اُن کے سینے سے نہ لگ سکا - پتہ نہیں یہ کس کا قصور تھا ؟ بے جی اگر کبھی ہوش
میں آجاتیں تو یہی کہتیں "میں ہی تمہاری قصوروار ہوں "

بہتے پانی میں عکس

ایک کہانی دراصل ہاتھ آئی تھی مگر جھلک دکھا کے کہیں غائب ہو گئی۔
اسے یوں غائب ہو جانا تھا تو پھر یہ آئی ہی کیوں تھی؟ اس کی تہہ میں نہ ہی جایا جائے تو بہتر ہے کہ اس طرح کے سوالات کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پاتے اور اُس دریا کی طرح جو صحرا میں جا نکلتا ہے، راستے ہی میں دم توڑ دیتے ہیں۔
لیکن جتنی جھلک وہ دکھا گئی تھی، اُس میں کئی کہانیوں کے رنگ تھے جو آخر میں مل کر ایک رنگ میں ضم ہو جاتے تھے۔ وہ کہانی تو کھو گئی۔ جسے لکھا جانا تھا مگر وہ رنگ ابھی تک آنکھوں میں جمے ہوئے ہیں جو ستاروں کی طرح جھلمل کرنے، بار بار اپنی جانب متوجہ کرتے ہیں۔
اِن رنگوں میں پہلا رنگ اُس دن کا تھا جس روز وہ برلن شہر میں اُترا تھا۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا غیر ملکی سفر تھا۔ ایک روشن، ٹھنڈے اور شیشے کی طرح صاف شفاف شہر میں اُترتے ہی ایک بالکل الگ سی خوشبو کا جھونکا اُس کے نتھنوں سے چھوا۔ یہ خوشبو اُس نے پہلے کبھی محسوس نہ کی تھی۔ یہ خوشبو، روشن، ٹھنڈے اور شفاف شہروں ہی کی فضا میں ہوتی ہے۔ اُسے پتہ چلا کہ وہ ایک اور ہی دیس میں آگیا ہے۔ جس کی ہواؤں میں خوشبو ہے، اُس نے زور سے سانس اندر کو

کھینچا اور اپنے پھیپھڑوں کو اُس خوشبودار ہوا سے پوری طرح بھر لیا۔ اُسے محسوس ہوا کہ یہ خوشبو اُس کی تمام رگوں میں اتر گئی ہے اور اُس کے جسم میں تازگی اور رعنائی آگئی ہے۔ نئی زمینیں جسم کے ساتھ روح کو بھی جگا دیتی ہیں۔ اَب وہ ایک بالکل نئی سرزمین میں تھا۔ نئی زمین کے ساتھ آسمان بھی نیا تھا۔ صاف شفّاف اور ہلکا نیلگوں اور اُس کی نیلاہٹ سارے شہر پر بکھری ہوئی تھی۔ شہر میں بسنے والوں کے چہرے شگفتہ اور سُرخ تھے۔ جن پہ ہلکی نیلاہٹ کا عکس بھی شامل تھا۔

سب سے پہلے اُس کی نظر جس منظر کو دیکھ کے ٹھٹھک گئی وہ ننگی پنڈلیوں کا سیلاب تھا۔ ریشمیں، سنہری اور ملائم پنڈلیاں جو رنگ برنگی سکرٹوں کے نیچے حرکت کرتی ہوئی دکھائی دیتیں۔ یہ تجربہ اُس کی زندگی میں ایک بالکل نیا واقعہ تھا۔ اس سے پہلے اپنے دیس میں اُس نے ایک آدھ یورپی یا امریکی خاتون کو سکرٹ میں دیکھا تھا مگر اُسے کوئی زیادہ حیرت نہ ہوئی تھی۔ لیکن اپنے دائیں بائیں آگے پیچھے، بازاروں میں، دوکانوں کے اندر چاروں جانب اُسے خوبصورت اور سنہری پنڈلیاں دکھائی دیں تو اُس کے اندر ملائمت کے ساتھ ساتھ حیرت بھی اُترنے لگی کہ وہ یہ کیسا منظر دیکھ رہا ہے۔ انسانی جسم کس قدر خوبصورت ہے۔ ٹانگوں کے بارے میں تو اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ وہ بھی اس قدر خوبصورت ہو سکتی ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی اُسے محسوس ہوا کہ جسم کا حُسن، جسم کی صدیوں کی دبی ہوئی خواہشوں کو ایک دم بیدار کر دیتا ہے۔ اُسے لگا کہ وہ تو صدیوں کا بھوکا ہے۔ پھر یہ بھوک اُس کی آنکھوں میں اُتر آئی۔ اُسے اپنا آپ بہت بُرا لگا کہ وہ سر سے پاؤں تک حیوان بن گیا ہے اور اُسے سارے شہر میں پنڈلیوں کے سوا کچھ اور دکھائی ہی نہیں دے رہا، نہ عمارتیں، نہ سامان، نہ باغ، نہ پھول پتے، یہاں تک کہ چہرے بھی۔ اُس کی نظر ابھی پنڈلیوں سے اُوپر اٹھی ہی نہ تھی۔ ان پنڈلیوں کے اوپر

چہرے کیسے ہیں، آنکھیں اور جسم کے خطوط کیسے ہیں؟ ان کا کوئی شائبہ تک ذہن میں نہ تھا۔ وہ صرف نرم، ملائم، خوبصورت، سنہری پنڈلیوں کے جنگل میں گھوم رہا تھا، بالکل کھویا ہوا، بدحواس، ہراساں اور خوف زدہ۔

پہلے چار روز اُس کے ہونٹوں پہ خشک پپڑی کی تہہ جمی رہی، آنکھوں میں سفیدی تھی اور اُبلتی ہوئی وحشت۔ وہ لذت کے بے نام سمندر میں ڈبکیاں لے رہا تھا، ہوش اور مستی کے کہیں درمیان درمیان۔ "شاید اسی لئے اُس کے اپنے دیس میں انسانی جسم کے ایسے حصّوں کو ستر میں چھپا کے رکھا جاتا ہے۔ جس سے جسمانی خواہشیں جاگ اُٹھتی ہیں اور قلب و ذہن میں فتور پیدا کرتی ہیں"۔ اُس کے ذہن میں ایسے ہی ایک خیال آیا چار روز بعد منظر وہی تھا۔ مگر اب وحشت میں کمی آگئی تھی۔ پھر دو روز بعد یہ منظر نظروں کے سامنے اس قدر عام ہو گیا تھا کہ آنکھوں نے اس کا نوٹس لینا ہی بند کر دیا۔ جسم کی اندھی خواہشیں جو ایک دم جاگ اُٹھی تھیں، خود بخود ٹھنڈی پڑ گئی تھیں۔ پنڈلیاں اب اس لینڈسکیپ کا ایک معصوم مگر خوشنما اور بے ضرر حصّہ بن گئیں تھیں۔

"تو کیا ایسا تو نہیں کہ جو چیز تم سے چُھپا دی جائے وہ چُھپتی نہیں اور جب ایک دم نظر آجائے تو دبی ہوئیں خواہشیں ایک دم جاگ اُٹھتی ہیں اور جسم و ذہن ہوس کی آگ میں سلگنے لگتے ہیں۔ لیکن اگر وہ چیز پردے سے باہر ہو اور اُسے آپ روز دیکھیں تو وہ کوئی عجوبہ نہیں رہتی، اُس میں حیرت کا کوئی عنصر نہیں رہتا، وہ عام سی چیز ہو جاتی ہے، موجود، مگر نارمل اور فطری۔ اب اُسے سنہری پنڈلیوں کے ساتھ گورے چٹے نیم عریاں جسم بھی کوئی ایسا عجوبہ نہیں لگتے تھے، وہ اُسے خوبصورت اور بھلے تو دکھائی دیتے تھے مگر اُس کے جسم میں غیر ضروری تغیّر پیدا نہیں کرتے تھے اور انہیں دیکھ کر کوئی حیوان اُسے پریشان نہ کرتا تھا اور نہ اُس کی آنکھوں

میں کوئی اندھیرا اُترتا تھا۔ خوبصورت چہرے اور خوبصورت جسم اب اُسے اچھے لگتے، وہ اُن کی ملائمت اور گداز کو بھی چپکے چپکے محسوس کرتا جیسے اس خاموش عمل میں اُس کی جمالیاتی حس کی تربیت ہو رہی ہو۔ اُسے پہلی مرتبہ محسوس ہوا کہ عورت کی موجودگی زندگی میں نرمی اور حسن کا اضافہ کرتی ہے اور کائنات میں سارے رنگ عورت کی موجودگی ہی سے ہیں اور مرد کی زندگی میں اُس کا وجود اتنا ہی ضروری ہے جتنی ہوا، بلکہ اس سے بھی زیادہ کہ وہ موجود ہو تو ہوا خوشبودار ہو جاتی ہے۔

پھر اُسے روزینا مل گئی۔ وہ اُسی ادارے میں کام کرتی تھی جہاں تربیت کے لئے وہ گیا تھا۔ روزینا نہایت خوبصورت، ذہین اور پڑھی لکھی تھی۔ وہ بیاہتا تھی اور اُس کا شوہر ایک بوہیمین قسم کا مصوّر تھا۔ اس کی تصویریں بہت کم بکتی تھیں مگر روزینا نے اُس کا سارا بوجھ خود اُٹھا رکھا تھا۔ فلیٹ کا کرایہ، کھانا پینا اور پہننا سب روزینا ہی نے اپنے ذمّہ لے رکھا تھا۔ وہ اُسے بہت چاہتی تھی اور اِس چیز کو کوئی اہمیت نہیں دیتی تھی کہ اُس کا مرد اس کے لئے کمائی کر کے نہیں لاتا۔ جب کبھی اُس کی کوئی تصویر بک جاتی تھی تو اُس دن وہ اپنے مصوّر دوستوں کو گھر پر بُلاتا اور ایک جشن سا برپا کر دیتا جس میں شراب پانی کی طرح بہتی اور اُس کے دوست صبح ہونے سے ذرا پہلے نیم بے ہوشی کے عالم میں وہیں پڑے پڑے سو جاتے۔ روزینا کے گھر میں فرنیچر نہ ہونے کے برابر تھا۔ ڈرائینگ روم میں دیواروں پر اُس کے شوہر کی تصاویر لٹکی ہوتیں نیچے فرش پر ایک معمولی قالین پر گدّے پڑے ہوتے جن پر آنے والے بیٹھ جاتے ہاں ایک کونے میں ایک الماری کتابوں سے بھری نظر آتی۔ روزینا کو پینٹنگز کے علاوہ موسیقی اور کتابوں کا شوق تھا۔ زیادہ تر کتابیں ادب، فلسفہ، شاعری اور سیکس پر تھیں۔

ایک شام جب وہ روزینا کے ڈرائینگ روم میں دیوار سے ٹیک لگائے گدے پہ بیٹھا جاز کی تازہ دھنیں سُن رہا تھا تو روزینا نے اُس سے کہا کہ تم نے اپنے بارے میں کبھی کچھ نہیں بتلایا، تم اکیلے ہو، شادی شدہ ہو یا گرل فرینڈ کے ساتھ رہتے ہو جسے تم اپنے وطن چھوڑ آئے ہو؟

"روزینا میں شادی شدہ ہوں اور ہمارے ہاں "گرل فرینڈ" کے انسٹی ٹیوشن کا وجود ہی نہیں، ہمیں کوئی لڑکی اچھی لگ جائے اور جی میں اُتر جائے تو ہم اُس سے اپنے جی ہی میں عشق کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ہمیں بالعموم پہلی نظر ہی میں محبت ہو جاتی ہے۔ آپ کی طرح نہیں۔ آپ لوگ تو محبّت کا لفظ بڑے محتاط ہو کر استعمال کرتے ہیں۔ آپ تو پہلے کچھ دیر تک ایک دوسرے کو "پسند" کرتے ہیں، پھر اس پسند میں تعلّق کی گہرائی اور بڑھتی ہے اور آپ ایک دوسرے کو سمجھنا شروع کرتے ہیں اور پھر خواہشوں اور اُمنگوں کے بھرپور اظہار کے بعد جب آپ اس قدر قریب آجاتے ہیں کہ درمیان میں کوئی فاصلہ باقی نہیں رہ جاتا تو پھر آپ محبّت کا لفظ استعمال کرنے لگتے ہیں۔ ہمارے ہاں اس طرح کی کوئی منزلیں نہیں۔ ہمارا معاشرہ آپ کی طرح آزاد معاشرہ نہیں اور ہمارے ہاں مرد اور عورت کے درمیانی فاصلے مذہبی و قانونی بندھن میں جکڑے جانے کی وجہ سے پاٹے نہیں جا سکتے۔ ہاں جو اِس فاصلے کو رسوم و قیود کی پابندی کے بغیر توڑ دیتے ہیں، وہ اپنی ہمّت اور چاہت کی شدّت پر ایسا کر لیتے ہیں مگر ہمارے لوگ ایسے "ہیر رانجھوں" کے قصّے تو سن لیتے ہیں مگر اُنہیں قبول نہیں کرتے۔

ہماری محبوبہ ہماری زندگی میں نہیں، صرف ہمارے دل میں بستی ہے"۔

روزینا یہ تفصیل سُن کر کچھ کنفیوز سی ہو گئی۔ اُس نے سگرٹ کو ایش ٹرے میں بجھاتے ہوئے حیرت سے پوچھا:

"تو کیا شادی سے پہلے آپ محبّت کے خوبصورت تجربے میں سے نہیں گزرتے؟"

"کم ازکم جس نسل سے میرا تعلق ہے، ہم میں سے اکثر نے ایک آئیڈیل سے محبت کی ہوتی ہے۔ جو زندگی میں تو ہاتھ نہیں آتا اور جو ہاتھ آتا ہے وہ ایک عدد منکوحہ بیوی ہوتی ہے۔"

"تو تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ بیوی تم لوگوں کی زندگی میں پہلی عورت ہوتی ہے؟"

"ہاں، یہی سمجھ لو۔"

"تو تمہیں ایک دوسرے سے محبّت کیسے ہو جاتی ہے جب تم ایک دوسرے کے لئے بالکل اجنبی ہوتے ہو؟"

"ہماری بیویاں تو جس مرد کے ساتھ شب گزارتی ہیں، اُسی مرد کے ساتھ اگلی صبح انہیں عشق ہو جاتا ہے۔ وہی اُس کا آقا، وہی مالک اور وہی محبّت کرنے والا۔"

"تم کیسی عجیب باتیں کر رہے ہو؟ ایک رات میں کیسے کسی سے عشق ہو جاتا ہے؟ میرا مطلب ہے کہ عشق کو آپ نے کیا سمجھ رکھا ہے؟ دو اجنبی زندگی میں پہلی مرتبہ ملتے ہیں، ملتے ہی وہ سب سے پہلے اپنے جسموں کی بھوک مٹاتے ہیں اور صبح اُنہیں ایک دوسرے سے محبّت بھی ہو جاتی ہے۔ محبّت جسموں کی بھوک مٹانے کا نام نہیں، یہ تو ایک جذبہ ہے، ایک دوسرے کی چاہت کا ایک دوسرے کو پانے کی خواہش کا، ایک دوسرے میں کائنات کی خوشیاں ڈھونڈنے کا، ایک دوسرے کی زندگی میں رنگ بھرنے کا ایک دوسرے کو معنی...."

وہ اب بولے چلی جا رہی تھی۔"جنسی تسکین کا جذبہ تو محبّت کے جذبے کی آخری منزل ہے۔"

"آپ کی جو آخری منزل ہے، ہماری وہ ابتدائی ہے"۔ میں نے اُس کی روانی کو توڑا۔

"تو پھر آپ لوگوں کا مسئلہ جنسی تسکین کا ہے، محبت کا ہرگز نہیں"۔

"میں نے کہا تو ہے کہ جس سے جنسی تسکین ملتی ہے، اُسی سے ہمیں محبت ہو جاتی ہے"۔

"ہو نہیں جاتی، کرنا پڑتی ہے۔ ایسے کیوں نہیں کہتے۔ مذہب کے بندھن معاشرے کے بندھن قانون کے بندھن، اِن مجبوریوں کے اندر تو آپ خوب کھُل کے محبّت کرتے ہوں گے!" وہ زور سے ہنسی۔

"تم تو ایسے ہی ہنس رہی ہو۔ ہماری بیویوں کو واقعی ہم سے عشق ہو جاتا ہے، وہ مرتے دم تک اپنے شوہروں سے وفا کرتی ہیں، اُن کا جنازہ اپنے شوہروں کے گھروں سے نکلتا ہے ....، اب میں بھی رواں ہو گیا اور بیویوں کی وفا کے قصّے سنانے شروع کر دیئے۔

وہ تھوڑی دیر تو سُنتی رہی مگر پھر ایک جھُنجھلاہٹ کے ساتھ بولی:

"یہ قصّے دلچسپ سنائی دیتے ہیں مگر اِن پہ یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ اچھا چھوڑو اِن قصّوں کو تم یہ بتلاؤ کہ تمہاری شادی کب ہوئی تھی؟"

"یہی کوئی جب میں تینتیس ۳۳ یا چونتیس برس کا تھا"۔

"اور اس سے پہلے تم کیا کرتے رہے؟"

"اس سے پہلے بیوی کے آنے کا انتظار کرتا رہا"۔

"یعنی مجرّد، بالکل مجرّد زندگی گزاری؟ کوئی عشق و شق، کوئی تجربہ؟ کچھ نہیں؟"

"نہیں، بہت سُوں کو چاہا، بلکہ ایک مقام تو یہ آگیا تھا کہ جس کو دیکھا

اُسی کو چاہنے لگ گئے۔"

"لیکن یہ تو چاہنا نہ ہوا، یہ تو بھوک مٹانے والی حالت کا طاری ہو جانا ہے۔"

"بھوک تو فطری چیز ہے،"

"ہاں مگر محبت تو بھوک سے کہیں اعلیٰ وارفع جذبہ ہے اور اُسی قدر فطری بھی ہے۔ دو شخص اگر زندگی میں ملے ہیں اور صرف ایک دوسرے کی بھوک مٹاتے ہیں۔ تو پھر وہ ایک دوسرے کی جسمانی ضرورت پورے کر رہے ہیں۔ اُن کے اس رشتے میں ضرورت کی تسکین تو ہے جو کہ ایک حیوانی سطح کی تسکین ہے مگر اس رشتے میں پیار کہاں ہے؟ اور جو رشتہ پیار سے خالی ہو وہ بے رنگ اور بے معنی ہوتا ہے۔ اس رشتے میں کیڑے مکوڑوں کی طرح انڈے اور بچے تو پیدا ہو جاتے ہیں مگر اس سے زیادہ اس رشتے کی اہمیت کوئی نہیں۔"

"میں نے میاں بیوی کے رشتے کو اس طرح سے کبھی نہیں دیکھا۔"

"اس لئے کہ تمہارے یہاں اس رشتے کے علاوہ اور کسی رشتے کا وجود ہی نہیں، تم وہی سوچو گے جو تمہارے تجربے میں آیا ہے۔ لیکن میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ عمر کے اس حصّے تک پہنچتے پہنچتے تمہیں جسمانی تسکین کی کبھی کوئی خواہش نہیں ہوئی تھی؟"

"کیوں نہیں، جنس کا جذبہ تو مرد کی زندگی میں پندرہ سولہ برس سے بیدار ہونے لگتا ہے اور قدرتی طور پہ وہ مخالف جنس میں دلچسپی لینا شروع کر دیتا ہے۔"

"ہاں تو پھر سولہ برس سے لے کر تینتیس برس تک اس شدت سے بھرے اور خوبصورت جذبے کو تم کیسے بہلاتے رہے؟"

"بہلاتا نہیں رہا، سُلاتا رہا،"

"پورے سترہ برس؟"

"جی ہاں، سترہ برس"

"ایک جذبہ جو قدرت بیدار کر دیتی ہے، اُسے وقت پہ تسکین دینے کے بجائے اُسے زبردستی سُلانے کی کوشش کرنا تو خلافِ فطرت عمل ہے"

"ہاں - ہے تو"

"لیکن تم یہ بھی جانتے ہو کہ خلافِ فطرت زندگی بسر کرنا اور ایسے جذبوں کے منہ میں لگام ڈالنا جو اپنے اظہار کے لئے بپھر رہے ہوں، انسان کو نارمل نہیں رہنے دیتا، میں حیران ہوں، تم شادی کے وقت تک پاگل کیوں نہیں ہو گئے، خلافِ فطرت زندگی سے تو نیوراسس ہو جاتے ہیں، اور انسان کی حرکات و سکنات غیر فطری بلکہ انتہا پسندانہ ہو جاتی ہیں، تمہیں کچھ نہیں ہوا تھا؟"

ایک لمحے کے لئے اُسے ایسے لگا کہ روزینا نے اُسے پکڑ لیا ہے۔ اُس کی محرومیوں اور کمزوریوں کو دیکھ لیا ہے۔ جیسے روزینا نے اُس کی تشخیص کر دی ہے۔ آدمی تشخیص سے بہت گھبراتا ہے، ڈاکٹر بھی مریض کی کمزوریوں ہی کو پکڑتا ہے، اس لئے ڈاکٹر سے بھی کچھ چھپا نہیں ہوتا، روزینا اُسے ذرا سی دیر کیلئے ڈاکٹر لگی جس نے اُس کی نفسانی کمزوریوں کو پہچان لیا ہو اور اُسے روزینا سے کچھ خفت سی محسوس ہوتی۔ اُسے دوستی کا رشتہ مریض اور معالج کے رشتے میں بدلتا ہوا دکھائی دیا۔

"روزینا۔ مجھے تم سے اتفاق ہے۔ ایسے معاشرے جہاں فطری جذبوں پہ سخت قدغن لگی ہوتی ہے، وہ لوگ کھُل کے آزادی کے ساتھ کچھ نہیں کر سکتے۔ مگر پھر اِن جذبوں کی تسکین کے لئے چور دروازے تلاش کرتے ہیں۔ سب کام ہونے لگتے ہیں مگر چوری چھپے، پسِ دیوار، رات کی تاریکی میں، نظروں سے اوجھل پھر جہاں سب کچھ زمانے کی نظر سے بچا کے کیا جائے وہاں براہِ راست بات کرنے

کے بجائے، پیغام کبوتروں اور کوؤوں کو دیئے جاتے ہیں، ایسا ممکن نہ ہو تو اس خدمت کے لئے قاصد معمور کئے جاتے ہیں، پھر رقیب رُو سیاہ گام گام پہ دکھائی دینے لگتا ہے، لفظوں کی جگہ اشارے کنائے میں گفتگو ہوتی ہے، خاموشی بھی بولنے لگ جاتی ہے۔ روزینا میں تمہیں سمجھا نہیں سکتا۔ تم ایک مختلف کلچرل پس منظر کی پیداوار ہو۔ ہر معاشرے کی محبت اس کے اپنے کلچرل بیک گراؤنڈ ہی میں جنم لیتی ہے۔"

"محبت جیسی فطری چیز جب چوری بن جائے تو ایسے معاشرے میں محبت کرنے والے کے دو چہرے ہو جاتے ہیں۔ ایک شرافت کا چہرہ اور ایک اصل چہرہ جو شرافت کے چہرے کے اندر چھپا ہوتا ہے۔ ایک معصوم جذبے کو آپ احساسِ جرم کے ساتھ سینوں میں پالتے ہیں۔"

روزینا یہ کہتے کہتے پریشان سی دکھائی دینے لگی۔ جیسے ایک اور کلچر کا رُخ دکھا کر میں نے اُسے دھچکا دیا ہو۔ ایسے لگتا تھا کہ وہ اپنا سر دیوار سے ٹکرانا چاہتی ہے۔ وہ سر ہلا ہلا کر بار بار اپنے آپ سے کہہ رہی تھی۔ "نہیں نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ محبت چوری نہیں ہو سکتی۔ محبت جرم نہیں ہو سکتی۔ پیار تو ایک پاکیزہ جذبہ ہے جو قدرت نے سینوں میں چھپا رکھا ہے۔ یہ تو ایک دوسرے کیلئے ہے یہ تو بانٹنے کے لئے ہے۔ اس سے تو زندگی کو جلا ملتی ہے۔ جو زندگی محبت اور پیار سے خالی ہے، وہ کیا زندگی ہے۔" ایسے لگتا تھا کہ وہ بڑبڑا رہی ہے اور خود کلامی کرنے لگی ہے۔ پھر ایک دم وہ اُٹھی اور سگریٹ کی خالی ڈبیا کو دیوار پر زور سے پھینکتے ہوئے بولی۔

"تم تو ایک صحت مند کلچر سے تعلق نہیں رکھتے۔ تم بیمار آدمی ہو۔ تم صحتمند انسان نہیں ہو۔ تمہارا نکتہ نظر بھی صحت مند نہیں ہو سکتا۔"

روزینا کہے جا رہی تھی اور وہ سُنے جا رہا تھا۔ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ اُسے کسی نے اس طرح دیکھا تھا۔ اپنے آپ کو جاننے کے لئے یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ خود کو کبھی دوسروں کی نظر سے بھی دیکھا جائے۔ اس طرح آدمی خود فریبی میں مُبتلا نہیں رہتا۔ باہر والے کبھی سچی بات بھی کہہ دیتے ہیں اور سچ کا ذائقہ تلخ ہوتا ہے، ہم صرف میٹھے کے پیچھے بھاگتے ہیں۔

روزینا کے یہاں ویک اینڈ پر وہ اب باقاعدگی سے جانے لگا۔ ویک اینڈ پہ اُس کا مصوّر اور اُس کے بوہیمین دوست بھی آتے۔ اُن میں ہر شخص اپنی جگہ ایک دلچسپ آدمی تھا۔ وہ اسٹیبلشمنٹ کے خلاف تھے، سرمایہ داری کے دشمن تھے، سوٹ اور ٹائی سے نہ صرف نفرت کرتے تھے بلکہ اُن کی محفل میں اس لباس کے ساتھ کوئی شخص داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ موجی لوگ تھے۔ فن کے خالق تھے، زندگی کو حسن بخشتے تھے، جس طرح زندہ رہنے چاہتے تھے، اس پہ اُنہیں کلّی اختیار تھا، وہ کسی دوسرے کی زندگی میں دخل دیتے تھے نہ اپنے اندازِ زندگی میں کسی دوسرے کو دخل دینے دیتے تھے، جیسے آزاد ہی پیدا ہوئے تھے اور آزادی کے ساتھ ہی زندگی کر کے اس دنیا سے چلے جائیں گے۔ اِن کے درمیان بیٹھے اُسے کئی دفعہ محسوس ہوتا کہ وہ ان لوگوں کے مقابلے میں ایک قیدی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔ اُس کے ہاتھ، پاؤں اور دماغ طرح طرح کی زنجیروں میں بندھے ہوئے ہیں۔ اس کا کھانا پینا اور پہننا بھی دوسروں کے ایروؤں سے ہے۔ زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں بھی اُس کے اپنے اختیار میں نہیں۔ ہر چیز کی اجازت معاشرے سے آتی ہے۔ اُس کا سانس گھٹنے لگا۔ سینہ بوجھل ہو گیا ہے جیسے اُس پہ پتھر کی سِل رکھ دی گئی ہو۔

روزینا کی ایک دوست میری بھی اس محفل میں کبھی کبھار آیا کرتی تھی۔ میری ایک آسٹریلین خاتون تھی مگر جرمنی میں اُس نے اپنے سے ایک کم عمر نوجوان سے شادی کر لی تھی اور اُس کی محبت میں جرمنی زبان بھی خوب سیکھ لی تھی اور فر فر بولتی تھی۔ وہ اپنے شوہر کے مقابلے میں بڑی عمر کی لگتی تھی اور اُسے اس کا احساس تھا اور اسی وجہ سے وہ اُس سے ٹوٹ کے پیار کرتی تھی اور اس شادی کے بعد اپنے آپ کو جرمن ہی سمجھتی تھی۔ اُس شام میری اپنے ساتھ جرمن وائٹ وائن لے کے آئی اور کہا کہ جرمن وائٹ وائن ہی آج رات چلے گی۔

میں نے اُسے پوچھا کہ جرمن وائٹ وائن اُسے اس قدر کیوں پسند ہے؟ اس پر میری نے وائن کلچر پہ ایک مدلل لکچر جھاڑ دیا۔ پتہ چلا کہ وائن جو صدیوں سے لوگ یہاں کشید کرتے ہیں — تو اس کا اپنا ایک کلچر تعمیر ہو چکا ہے۔ اس کے کشید کرنے سے لے کے اس کے پیش کرنے کے انداز پر کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ میری نے ایک بات تو یہ بتلائی کہ جرمنی میں شرابوں کے نام جرمنی میں بہنے والے دریاؤں کے ناموں پہ ہیں۔

"دریا زمین کی خشک رگوں کو نمی بخشتے ہیں اور زندگی کی بشارت دیتے ہیں۔ شراب جسم کی خشک رگوں میں خون کی گردش کو بڑھاتی ہے اور جسم کے ساتھ رُوح کو بھی سیراب کرتی ہے" پھر اُس نے ایک ایک کر کے بوتلیں میرے سامنے رکھنی شروع کر دیں۔"یہ موزل وائن ہے، یہ رائین وائین ہے، یہ ناھے ہے— یہ سب دریا ہیں، صدیوں پرانے اور جتنی پرانی شراب ہو گی۔ اسی قدر اس کا نشہ مستقل اور دیرپا ہو گا اسی لئے پرانی شراب نئی شراب کی نسبت بہت قیمتی ہے۔ سو سو سال پُرانی بوتلیں نیچے تہہ خانوں میں پڑی رہتیں ہیں۔

وقت ہر شے کو پختگی اور گہرائی بخشتا ہے"۔ پھر اُس نے رسم کے مطابق ایک بوتل کھولی میزبان کی حیثیت سے اُس کا ایک گھونٹ منہ میں ڈال کر اُسے گھمایا اور اُس کا ذائقہ زبان اور تالو دونوں پر محسوس کیا اور اعلان کیا کہ نہایت عمدہ ذائقہ ہے اور اُسے وائن کے مخصوص گلاسوں میں ڈال کے سب کی جانب گلاس بڑھانے شروع کیے۔ پھر جب ایک گلاس اُس نے اس نوجوان کی طرف بڑھایا جو اس محفل میں ابھی نیا نیا ہی تھا تو اس نے شکریے کے ساتھ گلاس میری کی جانب یہ کہہ کے لوٹا دیا کہ وہ شراب نہیں پیتا۔ میری کے ماتھے پہ شکنیں اُبھر آئیں مگر اُس نے جلد ہی اپنے آپ پر قابو پا لیا یہ دیکھتے ہوئے کہ یہ شخص اجنبی ہے اور شاید اس مشروب کی اہمیت سے بخوبی آگاہ نہیں ہے۔

میری نے گلاس تھام لیا اور اُسے پوچھا کہ کیوں اُس نے اس سے پہلے کبھی شراب نہیں چکھی؟ اُس نے جواب میں سر ہلاتے ہوئے کہا کہ "ہاں اُس نے کبھی اسے ہاتھ نہیں لگایا"۔

"کیوں؟" میری نے پوچھا۔

"ہمارے ہاں اُسے بُرا سمجھا جاتا ہے اور اس کے پینے کی ممانعت ہے"۔

"کیا کہا تم نے کہ اس کے پینے کی ممانعت ہے؟ وہ کیوں؟"

"کیوں کا مجھے پتہ نہیں مگر ہم اِسے پینا اچھا نہیں سمجھتے۔ ہاں البتہ یہ نعمتیں ہمیں اگلے جہان میں ملیں گی۔ اگر ہم نے اس دنیا میں عمل اچھے کیے"۔

ان الفاظ پر میری کا چہرہ پورے کا پورا حیرت میں بدل گیا۔ وہ ہاتھ میں گلاس تھامے بس اس کے چہرے کو تکتی رہی پھر لمبے وقفے کے بعد بولی۔

"اگلے جہان میں اس کا نام شراب ہی ہوگا یا کچھ اور؟"

"ہاں وہ شراب ہی ہوگی مگر اُس میں نشہ نہیں ہوگا"۔

"نشہ نہیں ہوگا؟ اچھا؟ تو پھر یہ آپ ہی کو مبارک ہو۔ ہم سے تو جب زندگی کا بوجھ نہیں اُٹھایا جاتا اور وحشت سی ہونے لگتی ہے۔ تو ہم اپنے اعصاب کو سکون بخشنے کے لئے تھوڑا سا نشہ کر لیتے ہیں۔ بس اتنا کہ اردگرد کی چیزوں کی کلر سکیم ذرا بدل جائے۔ نشہ کسی چیز کا ہو، انسان کو ہلکا کر دیتا ہے، ورنہ محض زندگی تو بڑی بے رحم اور سفاک حقیقت ہے۔"

میری کی باتیں سُن کر اس کا ایمان تھوڑا سا ڈول گیا اور اس کا جی چاہا کہ وہ بھی اِس دنیا کی کلر سکیم بدل کے دیکھے کہ وہ کیسی نظر آتی ہے۔ دنیا کو ایک ہی رنگ میں دیکھ دیکھ کے اُسے سخت اُکتاہٹ ہونے لگی تھی اور اُس کے اعصاب میں تناؤ بھی پیدا ہو گیا تھا۔ مگر اسے ہمت نہ ہوئی کہ وہ شراب کو اپنے ہونٹوں سے لگائے۔ اُس کے ذہن میں دائیں بائیں کئی چہرے کھڑے ہوگئے اور کئی آوازیں سر نکالنے لگیں اور وہ چہروں اور آوازوں کے اس ہجوم میں نروس ہو گیا اور اپنے آپ کو بہت کمزور محسوس کرنے لگا۔ اُس کے اعصاب میں مزید تناؤ پیدا ہو گیا اور اُس کا جی چاہا کہ وہ وائٹ وائن کے سمندر کے کنارے کھڑا رہنے کی بجائے وہاں سے دور بھاگ جائے جہاں تھوڑی دیر کے لئے اُس کے حواس اس کا ساتھ چھوڑ دیں اور اس دنیا کی سختی اُس کے جسم وجاں سے ذرا سی دیر کے لئے جُدا ہو جائے۔ مگر ایسا کیسے ہو سکتا تھا، جس چیز کی اُسے خواہش تھی، اس کا سامان تو میری اور اُس کے دوست کر رہے تھے۔ اُن کی کلر سکیم اب کچھ کچھ بدل چکی تھی۔ زندگی کی کرختگی اُنکے چہروں اور نظروں سے اُتر چکی تھی۔ اب وہ بادلوں کی طرح نرم ہو چکے تھے۔ روزینا اور اُن کے دوست کبھی گانے لگ جاتے، کبھی مکالمے شروع کر دیتے۔ مکالموں میں وہی آزادی اور اُڑان تھی۔ جس کے لئے وہ زندگی میں جدوجہد کر رہے تھے۔ یقیناً اُن کی گفتگو میں ایک تخلیقی قوت

کار فرما تھی، ایسے عالم میں اُن کے ہونٹوں سے جو لفظ نکل رہے تھے۔ اُسے آپ فلسفہ کہہ لیں، ادب کہہ لیں، شاعری کہہ لیں یا ایک کھرے اور سچے دل کا بیان'۔ بہر حال جو نام بھی آپ چاہیں اِسے دیں لیکن ان مکالموں میں ایک جادو تھا جو دل پہ اثر انداز ہوتا تھا اور اُسے پوری طرح گرفت میں لے لیتا تھا۔

وہ الگ کونے میں بیٹھا اپنے آپ کو بالکل تنہا اور کٹا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ اُس کی اس تنہائی کی خبر شاید میری کو ہو چکی تھی۔ وہ اپنا گلاس تھامے اُس کے پہلو میں آن بیٹھی۔ اتنا قریب کہ وہ میری کے جسم کی حدّت کو محسوس کر سکتا تھا۔ میری کے جسم کی گرمی سے اُٹھنے والی لہریں جب اُس کے جسم سے چھوئیں تو اُسے ایسے لگا جیسے وہ بھی ذرا سا نشے میں آگیا ہے اور اردگرد کی کلر سکیم بدلنے لگی ہے اور دنیا اُس سے مختلف لگنے لگی ہے جب میری اُس کے قریب نہیں آئی تھی۔ میری نے آگے جھک کر اپنا ایک بازو اُس کے گلے میں ڈال دیا۔ اُسے یوں لگا جیسے کسی نے اُسے اپنی پناہ میں لے لیا ہے۔ سکون کی لہریں اُس کے جسم کے روئیں روئیں میں اتر گئیں اور اُس کا جی چاہا کہ یہ بازو اسی طرح اُس کے گلے میں پڑا رہے اور اسی کیفیت میں اُسے نیند آجائے جس سے وہ کبھی بیدار نہ ہو۔

میری نے اپنا چہرہ اس کے چہرے کے قریب لاتے ہوئے مسکراتی ہوئی آنکھوں سے اُسے دیکھا:

"بہت تنہا اور اُداس دکھائی دے رہے ہو؟ ہے نا؟"

ان لفظوں کے ساتھ ہی اس نے میری کی گرم سانس اپنے ہونٹوں اور نتھنوں کے قریب محسوس کی۔ کائنات کی کلر سکیم مزید بدلنے لگی۔ فضا میں چاروں جانب نرم نرم پھوار برسنے لگی اور اس پھوار میں اُسے تھوڑا تھوڑا

نشہ ہونے لگا۔

"ہاں۔ تم نے ٹھیک کہا ہے، میں شریکِ محفل نہیں ہوں، محفل سے باہر ہوں، تنہا تو ہوں گا ہی۔"

"لیکن میں دیکھ رہی ہوں کہ تمہیں محفل سے باہر رہنے کے باوجود کچھ کچھ نشہ سا ہو رہا ہے۔"

وہ مسکرانے لگا۔ "ہاں۔ ہاں۔ مجھے بھی ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے مگر یہ نشہ شراب کا نہیں، تمہاری قربت کا ہے۔"

وہ کھل کھلا کر ہنسنے لگی۔ "میری قُربت سے تمہیں نشہ ہونے لگا ہے؟ میں تمہارے قریب کہاں ہوں؟ میں تو تمہیں زیادہ جانتی بھی نہیں، بس اتنا جانتی ہوں کہ تم بہت تنہا محسوس کر رہے ہو۔ میں نے سوچا تھوڑی دیر میں تم سے باتیں کروں اور تمہاری تنہائی کاٹنے میں مدد دوں۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو، مجھے واقعی کسی مدد کی ضرورت ہے۔"

میری اُسے دیکھ کے مُسکرانے لگی۔ جیسے وہ کوئی عجوبہ ہے۔

وہ بولی۔ "جسم کی قربت سے تمہیں یقیناً سکون ملا ہوگا۔ جسموں کی قُربت میں گرمی اور سکون ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو جسم کبھی ایک دوسرے کے قریب ہونے کے لئے نہ تڑپتے۔ یہ تڑپ سکون چاہتی ہے اور سکون لمس میں ہے۔ یہ جہاں بھی نصیب ہو، جیسے بھی نصیب ہو، سب سے بڑی نعمت ہے، انسان کے لئے سب سے بڑا انعام ہے۔ اس کو تلاش کرو، اس سے بھاگو گے تو ہمیشہ تڑپتے رہو گے۔"

"لیکن جسم ہی تو سب کچھ نہیں، جسم کے اندر جو رُوح ہے اُسے سکون نہ ملے تو صرف جسم کے سکون کا کیا فائدہ؟"

"رُوح کا سکون، جسم کے سکون کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ جسم رُوح تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے۔ جسم سب سے بڑی حقیقت ہے، اسی کے راستے سے رُوح کی اتھاہ گہرائیوں میں اُترتے ہیں۔ اس سے ڈرو نہیں، اس سے خائف نہ ہو۔ ہاں جسم کی قربت اگر صرف جسم حاصل کرنے کے لئے ہوگی تو وہ محض عارضی ہوگی اور صرف جسم کے انتشار کو مٹانے کے لئے ہوگی لیکن جب اس میں چاہت کا جذبہ آجائے گا تو وہ جسم و رُوح دونوں کا عرفان ہوگا۔"

"ہاں۔ تمہاری بات مجھ تک پہنچ رہی ہے۔ خود میں نے کئی بار یہ سوچا کہ میں شدید ہیجانی حالت میں بھی کبھی جسم خریدنے کا نہیں سوچ سکا۔ اس کے کئی مواقع بھی زندگی میں آئے کہ پیسوں کے عوض اچھی سے اچھی عورت مل سکتی تھی۔ مگر ہمیشہ مجھے اُس خیال سے ہی وحشت ہوئی کہ جب میں اُس عورت کے لئے کچھ محسوس ہی نہیں کرتا، کوئی جذبہ ہی نہیں رکھتا تو میں اپنے آپ کو اُس کے قریب کیسے لا سکتا ہوں۔ جسم کی خواہش تو جذبے کی خواہش سے پھوٹتی ہے، جذبہ ہی نہ ہو تو پھر قربت کیسی؟ ایسی قربت تو اُس جذبے کی توہین ہے جو انسان کو عطا ہوا ہے۔"

"تم نے "کام سوتر" پڑھا ہے؟"

"ہاں۔ مرد اور عورت کے پیار پر اس سے خوبصورت دستاویز میری نظر سے نہیں گزری۔"

"تم نے دیکھا ہے کہ اس میں جنسی جذبے اور جنسی عمل کو ایک جمالیاتی مقام اور تقدّس بخش دیا گیا ہے۔ اُسے زندگی کے ایک صحت مند اور خوبصورت ترین عمل کے طور پہ پیش کیا گیا ہے۔ اِس میں حُسن کی جگمگاہٹ دکھائی ہے، اور زندگی کے لطیف ترین اور نازک جذبوں کے روپ دکھائے گئے ہیں۔ جن

بیمار لوگوں کو اس رشتے میں کثافت دکھائی دیتی ہے، اُنہیں یہ کتاب ضرور پڑھنا چاہیئے کہ اُن کے خوف دور ہوں اور اُن کے ذہنوں میں جو جالے لگے ہوئے ہیں، وہ صاف ہو جائیں۔"

"اصل میں ہم میں سے اکثر خوف زدہ ہیں اور ہمارے ذہنوں میں گرہیں لگی ہوئی ہیں جو ہمیں زندگی کی مسرتوں سے لطف اندوز نہیں ہونے دیتیں۔"

"ہاں یہ میں نے بھی محسوس کیا اور مجھے اس کا تجربہ ہے۔" میری بولی "شادی سے پہلے میری زندگی میں ایک شخص آیا تھا، آپ ہی کے دیش کا تھا، نہایت خوبصورت اور وجیہہ۔ آپ کے دیش کے اکثر لوگ خوبصورت اور سڈول جسموں کے ہوتے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔ ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے۔ ہمارے درمیان کوئی فاصلہ نہ رہا۔ ایک روز لیٹے لیٹے میں نے اُس سے یونہی پوچھا۔ پیار کا کھیل ایک ہی جگہ کھیلتے رہیں تو اس میں یکسانیت سی آجاتی ہے اور اُس میں کوئی چارم نہیں رہتا۔ یہ ایسی رسم ہے کہ اِس میں تنوع نہ رہے تو پھر یہ اپنے آپ کو دُھرانے کا عمل بن جاتا ہے۔ ساری ایکسائٹمنٹ ختم ہو جاتی ہے۔"

"تمہارا مطلب میں نہیں سمجھا۔ تم کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"میں کہنا یہ چاہتی ہوں کہ لینڈ سکیپ بدلنا چاہیئے۔ اس کے بدلنے سے پیار کے عمل میں ایک نئی جہت کا اضافہ ہو جاتا ہے۔"

"یعنی؟"

"یعنی یہ کہ ہمیشہ ایک ہی چار دیواری اور ایک ہی چھت کے نیچے کبھی کبھی گھٹن ہونے لگتی ہے۔"

"تو؟" اُس نے حیرانی سے سوال کیا۔

"تو؟ تو میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ لینڈ سکیپ بدلو۔ یہ ایک خوبصورت

تجربہ ہے۔ تم خود محسوس کرو گے۔"

"ذرا اور کھل کے بیان کرو، میں پوری طرح نہیں سمجھا۔ میں جہاں پیدا ہوا ہوں، وہاں تو تخلیقی عمل شب کی تاریکی اور انتہائی تخلیے میں ہوتا ہے اور یوں بھی تمام تخلیقی کام تخلیئے ہی میں ہوتے ہیں۔ شاعری اور مصوری سے لے کے پیار کا عمل۔"

"کبھی کھلے آسمان کے نیچے بھی پیار کیا ہے؟ گھرے جنگلوں کے درمیان دریا کے کنارے، زمین کے سبزے کے اوپر، پھولوں کے درمیان، ہلکی، نیلی دھوپ میں، ٹھنڈی ہواؤں کے اندر، پرندوں کے سحر آگیں گیتوں کی بیک گراؤنڈ میں۔ جب تمہارے اور نیچر کے درمیان کوئی فرق نہ رہے اور تم نیچر کا ایک حصہ بن جاؤ۔ بہتے پانی میں عکس تو زندگی کے اعتبار کو بڑھاتے ہیں۔ بہتا پانی زندگی کی علامت ہے جسم مٹ جاتے ہیں مگر بہتے پانی کے عکس تو جب تلک دریا بہتے ہیں اُن کے ساتھ ساتھ چلتے رہتے ہیں۔ بہتے پانی کے عکس گزرتے ہوئے لمحے کو ازلی کیفیت سے دوچار کر دیتے ہیں۔ پیار بھی تو یہی ہے کہ آپ گزرتے ہوئے لمحے کو ذرا سی دیر کے لئے تھام لیتے ہیں۔ وقت گزر جاتا ہے مگر وہ لمحہ جو گرفت میں لیا تھا وہ وقت کے چہرے پہ نقش ہو جاتا ہے۔

عشق و محبت کرنے والے اسی لئے ابد کا حصہ بن جاتے ہیں کہ انہوں نے دوڑتے لمحوں میں ایک لمحے کو ذرا سی دیر کے لئے روک دیا اور دوام ہو گئے لوک کہانیوں اور لوک گیتوں میں ان عاشقوں کے چہرے نظر آتے ہیں اور ہر دور میں لوگ ان چہروں میں اپنا چہرہ تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اُس نے جب یہ گفتگو سُنی تو اُس نے بے ساختہ کہا کہ ہاں میں محسوس کرنے لگا ہوں کہ یہ ایک خوبصورت تجربہ ہو گا۔"

"لیکن ہم پہلے شخص نہیں ہوں گے جو اِس تجربے میں سے گزر رہے ہوں گے۔ سخت زمین سے الگ ہو کر پانی کے اُوپر زندگی کرنا بادشاہوں کا طریق کار بھی رہا ہے۔ تم نے دیکھا ہو گا کہ آج بھی یورپ میں جب کسی بادشاہ یا شہزادے کی شادی ہوتی ہے تو ہنی مون کے لئے وہ ایک بڑی کشتی میں سوار ہو کر کچھ دیر کے لئے دریاؤں اور سمندروں میں چلے جاتے ہیں۔ کبھی تم نے سوچا کہ کیوں؟"

"نہیں" وہ بولا۔

"پانی کی چڑھتی اور اُترتی لہروں کے ساتھ انسانی جسم ہم آہنگ ہو جائیں تو پیار کرنے والے کائنات کے (RHYTHM) کا حصّہ بن جاتے ہیں۔ اور اُن کے وجود مسرّت کی آخری بلندیوں کو چھو لیتے ہیں۔ زندگی بے کنار ہے اور اس میں ممکنات کی حدود کیا ہیں، اس کا اندازہ ناممکن ہے۔"

میری نے بتلایا کہ وہ نوجوان یہ سُن کر اس قدر مسحور ہو گیا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔" بہار کا موسم تھا۔ بارش ایک روز پہلے آئی تھی اور دھرتی کا چہرہ دھو گئی۔ ہم ایک جنگل میں چلے گئے۔ پھولوں سے لدی جھاڑیوں اور گھنے درختوں میں سے گزرتے ہوئے ہم ایک ندی کے کنارے پہنچ گئے۔ جنگل میں تازہ پھولوں کی خوشبو مست کئے دیتی تھی۔ چاروں جانب خاموشی تھی اور اس خاموشی میں کسی پرندے کا گیت تھوڑی دیر کے لئے کانوں میں رس اُتار دیتا تھا۔ ایسی خاموشی کہ ندی کے پانی کے چلنے کی بھی آواز نہ تھی جیسے وہ سو رہا ہو۔

"ہم ایک دوسرے کی آنکھوں میں اپنے عکس دیکھ رہے تھے اور ایک بے خودی کی کیفیت ہم پہ طاری تھی۔ میں نے جسم سے تمام کپڑے اُتار دیئے کیا دیکھتی ہوں کہ اُس نوجوان نے ایک دم آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے اس پہ حیرت ہوئی کہ اس سے پہلے تو اُس نے یوں کبھی نہیں کیا تھا۔ میں نے کہا

آنکھیں کھولو، میں وہی ہو جسے تم پیار کرتے ہو۔ آج آنکھیں کیوں بند کرلیں؟ اُس نے کہا کچھ نہیں، کچھ نہیں۔ مجھے یوں لگ رہا ہے کہ ہمیں چاروں طرف سے لوگ دیکھ رہے ہیں۔

"میں نے اُسے یقین دلایا کہ یہاں ہمیں کوئی نہیں دیکھ رہا سوائے نیلے آسمان کے، پانی میں جھکی ہوئی شاخوں کے اور خاموش بہتے ہوئے پانی کے جس میں میرے جسم کے عکس سے ہلکی سی تھرتھراہٹ پیدا ہوگئی ہے۔

"اُس نے اب آنکھوں پہ ہاتھ رکھ لئے۔ میں نے ضد کی کہ وہ آنکھوں سے ہاتھ ہٹالے۔ اُس نے ہاتھ اُٹھائے تو اس کی آنکھیں جیسے ایک دم چُندھیا سی گئیں۔ گھبراہٹ سے اُس کے ماتھے پہ پسینہ آنے لگا تھا۔ میں نے یہ گھبراہٹ دیکھ کر اُس سے میٹھی میٹھی باتیں شروع کیں مگر نہ اُس کا پسینہ تھمتا تھا اور نہ اُس کے چہرے کی رنگت واپس آنے کا نام لیتی تھی۔ آخر میں نے اُسے پوچھا کہ تم اس قدر حواس باختہ کیوں محسوس کر رہے ہو۔ ہمارے سوا اس کائنات میں اور کوئی نہیں۔ اس لینڈ سکیپ میں زندگی ہمارے ہی وجود سے ہے۔ اُس نے کہا لیکن مجھے تو یہ محسوس ہو رہا ہے کہ یہاں ہر جھاڑی کے پیچھے ایک شخص چھپا ہوا ہے اور ہزاروں لاکھوں آنکھیں ہمیں دیکھ رہی ہیں۔ جلد ہی ان جھاڑیوں کے پیچھے سے لوگ ہاتھوں میں پتھر لئے ہم پر ٹوٹ پڑیں گے اور ہمیں مار ڈالیں گے۔

"میں نے محسوس کیا کہ وہ خوف زدہ ہوگیا ہے اور نیلا آسمان اور کھلی ہواؤں نے اُس کے اوسان خطا کر دیئے ہیں۔ میں نے اُسے کہا۔ معلوم ہوتا ہے۔ تمہیں خوف نے آن لیا ہے اور تم گھبرا گئے ہو۔ میں نے اُسے تھوڑی سی برانڈی دی یہ کہہ کر کہ تمہاری طبیعت ٹھیک دکھائی نہیں دیتی، بہتر ہے کہ

تم تھوڑی سی یہ پی لو۔ تم اس سے بہتر محسوس کرو گے۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تو وہ ٹھنڈا ایخ ہو چکا تھا اور سارے جسم میں ہلکی سی کپکپاہٹ ہو رہی تھی۔

"برانڈی سے اُس کے جسم میں گرمی پھر سے لوٹ آئی۔ میں نے کہا آنکھیں کھول کے دیکھو۔ جھاڑیوں کے پیچھے سے تمام لوگ مایوس ہو کر بھاگ گئے ہیں۔ اُس نے کہا کہ تھوڑی سی برانڈی اور پلاؤ، میری طبیعت اِس سے ٹھیک ہونے لگی ہے۔ میں نے دوسرا پیگ پلاتے ہوئے کہا: دوسرے پیگ کے بعد تمہاری آنکھوں میں روشنی بھی لوٹ آئے گی اور کانوں میں پرندوں کے گیت بھی اُترنے لگیں گے۔

"دیکھتے ہی دیکھتے جیسے روشنی زمین اور آسمان کے درمیان پھیل گئی۔ اُس نے اپنے بازو پھیلا دیئے جیسے ساری کائنات کو گلے لگا رہا ہو۔ ذہن کے اندر کے جالے اُتر گئے تھے اور جھاڑیوں کے پیچھے اب کوئی نہیں تھا۔ زندگی بہتے پانی میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ سبزہ، پھول، مٹی، پانی اور نیلا آسمان ایک ہو گئے تھے۔ زندگی پھیل کر زمین و آسمان کی اُن حدوں کو چھو رہی تھی۔ جہاں وہ ایک دوسرے میں مل جاتے ہیں، ایک دوسرے میں ضم ہو جاتے ہیں۔ ہم میں سے ایک آسمان تھا اور ایک زمین۔"

یہ کہتے ہوئے میری نے وائن کو منہ سے لگا کر سارا گلاس خالی کر دیا اور یوں ایک طرف گر گئی جیسے وہ تھک کر ٹوٹ گئی ہو۔ روزینا ایک پریشان ڈاڑھی والے مصوّر سے مکالمے میں کھوئی ہوئی تھی۔ اُس کا شوہر چار دوستوں کے درمیان بیٹھا امپریشن ازم پر زبردست بحث کر رہا تھا۔ سارا کمرہ سگرٹوں کے دھوئیں سے بھر گیا تھا۔ میں نے میری کے کندھے کو ہلایا اور کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں نیند

آنے لگی ہے۔ اُس نے کہا نہیں، میں تمہیں یہ واقعہ سُناتے سُناتے تھکاوٹ محسوس کرنے لگی ہوں۔

"تجربوں کو دوبارہ زندہ کرنا بھی تو تخلیقی عمل ہے اور تخلیق یقیناً تکلیف دہ ہوتی ہے۔"

میری نے کہا۔ "ہاں یہ بھی درست ہے لیکن یہ واقعہ سُناتے سُناتے مجھے یک لخت اِس چھت اور چاردیواری سے وحشت سی ہونی لگی ہے۔ اِس قدر گھٹن کا احساس ہو رہا ہے کہ جی چاہتا ہے کپڑے پھاڑ کر باہر بھاگ جاؤں۔ میری کے شوہر نے میری کی اس کیفیت کو بھانپ لیا تھا۔ وہ اُٹھا اور اُس کو زمیں سے اُٹھا کر بازو سے سہارا دیتے ہوئے "آؤف ویدر ذہن" (پھر ملیں گے) کہتا ہوا اُسے کمرے سے باہر لے گیا۔

برلن کی اِن شاموں نے آہستہ آہستہ اُسے برلن سے متعارف کروا دیا تھا اور وہ اس شہر سے مانوس ہوگیا۔ برلن شہر بھی لاہور کی طرح شہروں کا شہر تھا۔ یہ شہر دوسری جنگ عظیم کے بعد دو حصّوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ایک دیوار شہر کے درمیان سے ٹیڑھی میڑھی ہو کے گزرتی تھی جس سے کسی گھر کے رہائشی کمرے مغربی برلن میں آگئے اور صحن مشرقی برلن میں چلا گیا۔ ایک عبادت گاہ کو بھی دیوار اسی طرح کاٹتی ہوئی نکل گئی تھی کہ عبادت خانہ دو حصّوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ مغربی اور مشرقی برلن اب دو مختلف شہر تھے جو دو مختلف نظام ہائے زندگی کی عکاسی کرتے تھے۔ مغربی برلن کے درو دیوار پہ خوشحالی تھی، مشرقی برلن میں جنگ کی تباہ شدہ عمارتوں کے ڈھانچوں کے درمیان چپ چاپ اور خاموش ہجوم تھا، بھیڑ بکریوں کی طرح۔ کھانے کے ریستورانوں

یں لوگوں کے لمبے لمبے کیو لگے ہوئے تھے۔ جو لنچ کے لئے وہاں جمع ہوتے تھے۔ اگر ذرا سی بھی دیر ہو گئی تو شام کے چار بجے تک ان ریستورانوں میں کھانا نہیں ملتا تھا۔ وہ مغربی برلن میں ٹھہرا ہوا تھا مگر کبھی کبھار وہ مشرقی برلن کی سیر کو بھی نکل جاتا اور ایک انجانے ڈیپریشن کے ساتھ دن گزار کے واپس لوٹتا۔ مغربی برلن میں اس نے زیادہ وقت دانشوروں اور فنکاروں کے درمیان گزارا اور جرمن قوم کے ذہن اور اُن کی زندگی کرنے کے انداز پر غور کرتا رہا۔ کوئی چھ سات برس بعد اُسے پھر دوبارہ جرمنی جانے کا اتفاق ہوا۔ اب کی بار وہ برلن کی بجائے مغربی جرمنی کے ہین لینڈ میں اُترا اور کولون، بون، میونخ اور فرینکفرٹ میں گھومتا رہا۔ یہ سفر کئی لحاظ سے سیر حاصل تھا۔ اس میں اس کی ملاقاتیں نہ صرف جرمن باشندوں سے ہوئیں بلکہ اُن سے بھی جو یورپ اور ایشیا کے دوسرے ممالک سے رزق اور "اعلیٰ زندگی" کی تلاش میں اس ملک میں آ کے آباد ہو گئے تھے۔

ان میں سے ایک وسیم تھا، جب یہ وہاں رہ کے یہ انکشاف ہوا کہ جرمن اور دوسری یورپی اقوام، جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کے اعتبار سے ایشائی اقوام سے بہتر طور پہ تخلیق کی گئی ہیں اور اُن کی یہ برتری زندگی کے ہر شعبے میں نظر آتی ہے۔ وسیم کی کھال کا رنگ تو تبدیل نہیں ہو سکتا تھا مگر اس کا ذہن اب مغرب کا ذہن تھا اور اس میں کوئی قباحت کی بات نہ تھی کہ وسیم نے اُس سرزمین کو جب اپنا مسکن بنایا تو اُسے پوری طرح قبول کر لیا اور اپنے پُرانے سب رشتے توڑ دیئے۔ اب وہ اپنے تئیں وہاں ایک آزاد اور پر مسرت زندگی بسر کر رہا تھا اور چاروں طرف اُسے حسن و خوبی ہی دکھائی دیتے تھے۔

پھر اچانک اُسے ایک روز ایک محفل میں فرح اور شازیہ ملیں۔ دونوں

تیکھے نقشوں والی سانولے رنگ کی لڑکیاں تھیں۔ دونوں یہاں جاب کر رہی تھیں۔
فرح کو وطن سے نکلے زیادہ عرصہ ہوگیا تھا اور شازیہ مقابلتاً چند سالوں سے وہاں
قیام پذیر تھی۔ دونوں خواتین مشرقی لباس میں تھیں مگر مشرق اب صرف
لباس تک ہی محدود رہ گیا تھا۔ مشرق میں بھی جینے کی آزادیاں تھیں۔ مگر جس
حصے سے وہ کوچ کر کے وہاں گئی تھیں، وہاں مذہبی گھٹن اور سماجی دباؤ اس
قدر زیادہ تھا کہ اُنہیں اس ملک میں پہنچ کر آزاد فضا میں سانس لینے کا احساس
ہوا تھا اور اس احساس سے وہ بے حد مغلوب دکھائی دیتی تھیں۔ اُنہیں
اپنے چھوڑے ہوئے معاشرے سے بہت سی شکایتیں تھیں۔ یہ کہ وہاں لوگ ایک دوسرے
کی ذاتی زندگی میں ضرورت سے زیادہ دخل دیتے ہیں، عورتوں کو دوسرے
درجے کی مخلوق سمجھتے ہیں اور انہیں زیور اور کپڑا پہنا کر غلام بنائے رکھتے
ہیں، زندگی کے ساتھی کے انتخاب کا حق بزرگوں نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا
ہے، جس کے ساتھ چاہتے ہیں نتھی کر دیتے ہیں، کھانے، پینے اور پہناوے
پر پابندیاں ہیں، سوچ پر پابندیاں ہیں، آپ سے توقع کی جاتی ہے کہ آپ
سوچ کے اُس دھارے کا حصہ بن جائیں جو اکثریت کی سوچ ہے، پھر یہی نہیں
سوچ کے ساتھ ساتھ سوچنے کے اظہار پہ بھی پابندی ہے، پابندی، پابندی
پابندی۔ زنجیریں ہی زنجیریں چاروں جانب ہاتھوں میں، پاؤں میں۔
کسی کی شخصیت مکمل طور پر اُبھر نہیں پاتی۔

شازیہ، فرح سے زیادہ تیز اور ہوشیار تھی اُس نے کہا۔

"اپنی زمین سے بہت عشق کر لیا ہم نے، اب اپنے لئے جینا شروع
کیا ہے۔"

اِس جملے پہ اس کے کان کھڑے ہوگئے۔ اُس نے فرح کی جانب دیکھا

کہ کیا وہ بھی اس خیال کو کنفرم کرتی ہے تو فرح اپنے وسکی کے گلاس میں جھانکنے لگی اور اُسے ہلا ہلا کر اُس میں اپنا عکس دیکھنے میں کھو گئی۔ فرح ویسے بھی اپنے آپ میں لئے دیئے رہتی تھی اور زیادہ گفتگو کرنا اور وہ بھی ایسے شخص سے جو اُس کے وطن سے ہو، اُسے اچھا نہ لگتا تھا۔ وہ اپنے وطن اور وہاں سے تعلق رکھنے والوں پہ نفرین بھیجتی تھی اور اُن سے کسی قسم کا تعلق باقی نہ رکھنا چاہتی تھی۔

اُس نے شازیہ کا جملہ سننے کے بعد اُسے ایسے ہی پوچھا۔

"تم نے صرف اپنی سرزمین سے ہی عشق کیا تھا یا اُس سرزمین میں رہنے والوں کو بھی کوئی گھاس ڈالی تھی؟"

"جوانی میں گھاس کس کے پاس نہیں ہوتی؟" شازیہ تڑاخ سے بولی۔

"یہاں آنے سے پہلے میں نے کوئی دس بارہ عشق تو کئے تھے۔" اُس نے شیری کا گھونٹ حلق میں اُنڈیل کر میری جانب دیکھا۔

"کیوں؟ آپ کو حیرانی ہوتی ہے یہ سُن کر؟"

"ہاں، کچھ کچھ، اِس لئے کہ میں نے اپنی جوانی وہاں بِتا دی ہے مگر ہمیں یہ دولت اس قدر نصیب نہ ہوئی" ــــ وہ بولا۔

"آپ پھر بانجھ نسل سے تعلق رکھتے ہوں گے جو ہمیشہ شرافت کی تلاش میں رہتی ہے۔" شازیہ نے تیزی سے جملہ اُس کے منہ پر پھینکا۔

وہ اس پہ مُسکرا دیا اور کہا کہ جب تمہیں اتنے مواقع حاصل تھے تو پھر تم وہاں سے کیوں بھاگ آئی؟

"اس لئے کہ میں نے دیکھا کہ میں یہاں رہ کر آزاد زندگی نہیں گزار سکتی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں وہاں جا کے رہوں گی جہاں کا لائف اسٹائل مجھے سوٹ کرے گا۔ سو میں وہاں سے چلی آئی۔

"مگر آزادی آپ کسے کہتی ہیں۔ وہاں لوگ جب آپ کے لائف اسٹائل کو دیکھتے ہیں تو وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ نئی نسل مادر پدر آزادی چاہتی ہے، ملنے کی آزادی، سیکس کی آزادی وغیرہ وغیرہ"

"نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ وہ لوگ آزادی سے مُراد صرف سیکس کی آزادی سمجھتے ہیں ——— اُس معاشرے میں تو لڑکی کسی سے مُسکرا کر بات کرلے تو بھی وہ جرم سمجھا جاتا ہے۔ آپ عورت کو کیا سمجھتے ہیں، صرف سیکس سمبل؟ کیا عورت کا معاشرے سے صرف ایک ہی رشتہ ہے؟ سیکس کا رشتہ؟ وہ ماں بھی تو ہے، بہن بھی تو ہے، بیوی بھی ہے، بیٹی بھی ہے۔ بہو بھی ہے، دوست بھی ہے اور... اور اِن سب سے پہلے انسان بھی ہے۔ آپ کو وہ صرف عورت ہی دکھائی دیتی ہے۔ جب اس قدر دبیز پردے آنکھوں پہ پڑ جائیں تو پھر کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ مجھے ایسے معاشرے میں شدید گھُٹن محسوس ہو رہی تھی، میں نے وہاں سے نکلنے کا فیصلہ کرلیا"

"اب آپ کو یہاں آکر کیا محسوس ہو رہا ہے؟"

"محسوس کیا ہو رہا ہے۔ بس یہاں میں جس طرح کی زندگی گزارنا چاہتی ہوں، اُسی طرح سے گزار رہی ہوں اور مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں بے حد خوش ہوں۔ زندگی کا مقصد مُسرّت ہی کی تلاش ہے نا؟ ہم سب مُسرّت اور سکون کی تلاش میں دن رات سرگرداں ہیں۔ آپ کو اس سے اختلاف ہے کیا؟"

"نہیں، یقیناً ہم سب اپنے لئے ایک خوشیوں بھری زندگی ہی کی تلاش میں رہتے ہیں لیکن کیا وہ ایسی زندگی ہے جس میں کسی قسم کی کوئی پابندی نہ ہو؟"

اُس کا لہجہ سنجیدہ ہونے لگا تھا۔

"نہیں میں کب کہتی ہوں کہ تمام پابندیوں کو اُٹھا دینے کا نام آزادی ہے۔

آپ کا کیا خیال ہے میں یہاں کسی پابندی کے بغیر جنگل کے قانون کے تابع حیوانوں کی طرح چھلانگیں مار رہی ہوں؟ میں زندہ رہنے کے لئے باقاعدہ ملازمت کرتی ہوں، ملازمت کی تمام پابندیوں کو قبول کر رکھا ہے، دوسرے تمام فرائض جو مجھے ادا کرنا ہے، انہیں اپنی ہمت کے مطابق پورا کرتی ہوں، وقت پہ دفتر جاتی ہوں، شام تک کام کرتی رہتی ہوں، اپنا رزق حلال کر کے کھاتی ہوں، کسی کی چوری نہیں کرتی کبھی کسی سے دغا نہیں کیا جھوٹ سے نفرت ہے، منافقت سے نفرت ہے، جو اندر ہوں، وہی باہر ہوں، مجھے آپ کھلی کتاب کی طرح پڑھ سکتے ہیں۔" وہ بولے جا رہی تھی اور اس کے لہجے میں زور آگیا تھا" اور آپ کیا چاہتے ہیں کسی انسان سے؟ اب یہ سب کچھ کرنے کے بعد اگر میں خوشی و مسرت کے چند لمحے اپنی مرضی اور پسند سے گزارنا چاہتی ہوں تو آپ لٹھ لے کر آجاتے ہیں۔ میں اپنی زندگی کے بارے میں کسی کو لٹھ استعمال کرنے کا حق نہیں دیتی۔ جس معاشرے کو میں نے ترک کیا ہے وہاں انسان اپنی ۳/۴ زندگی ایسے گزارتا ہے جیسے لوگ چاہتے ہیں اور بمشکل ۱/۴ زندگی پہ بھی آپ کا اختیار مکمل نہیں۔ آپ اپنے لئے جیتے ہیں یا محض دوسروں کو خوش کرنے کے لئے؟ بتلائیے نا مجھے؟ آپ آزادی کی بات کرتے ہیں۔ کہاں ہے فرد کی آزادی؟ اُسے فیصلے کا حق دیجئے کہ وہ اپنی زندگی کا خود مختار ہو۔ اگر وہ غلط راستہ پہ چلتا ہے، تو اُسے اِس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا، وہ اس سے نہیں بچ سکتا۔ مگر آپ دوسروں کے کیوں خود ساختہ ٹھیکیدار بنے ہوئے ہیں؟" شازیہ کے لہجے میں اب تلخی اُبھر آئی تھی۔

"میں کہتی ہوں وہ معاشرہ جہاں انسان کو عمل کی آزادی نہیں، اُس معاشرے سے کہیں زیادہ بدتر اور مفلس ہے جہاں رزق کی بہتات تو ہے مگر ذہن اور عمل کی آزادی نہیں۔"

شازیہ کو بند باندھنا اب مشکل دکھائی دے رہا تھا۔ فرح اِس ساری گفتگو کے درمیان خاموش رہی مگر جب شازیہ معاشرے کی لگائی ہوئی پابندیوں پہ مُعترض ہوتی تو فرح کی نظروں میں نفرت سی جھلکنے لگتی تھی اور وہ زبان سے کچھ کہنے کے بجائے صرف ناک سکیڑ کر نفرت کے جذبے کو اور واضح کر دیتی تھی اور اُس کی ناک میں لگی ہوئی تیلی بھی اس نفرت میں شریک ہو جاتی تھی۔

اُس نے شازیہ سے کہا۔ "اچھا اب چھوڑو اس موضوع کو۔ یہ بتلاؤ کہ یہاں آ کر بھی کوئی زوردار عشق کیا ہے؟"

اُس نے کہا۔ عشق زوردار ہی ہوتا ہے ورنہ عشق نہیں ہوتا۔ آپ لوگوں کی طرح نہیں کہ عمر بھر عشق کرتے رہے اور جس سے عشق کیا جا رہا ہے اُسے خبر تک نہیں ہو پاتی۔ لعنت ہے ایسے عشق پر۔ اسے عشق کہتے ہیں ایسے ہی تخیّر بنے بیٹھے ہیں۔ کبھی محبوب کا ہاتھ تو پکڑو، اُسے گلے تو لگاؤ۔ میں نے وہاں جتنے بھی عشق کیے وہ بھرپور عشق تھے۔ میرے عشق کی خبر میرے عاشقوں کے والدین کو بھی ہو جاتی تھی اور سب سے زیادہ بدحواس وہی ہونے تھے۔"

"یہاں کی کیا رپورٹ ہے؟"

"یہاں میں ایسے مردوں سے دُور رہتی ہوں جو میرے وطن سے ہیں۔ وہ بہت پوزیسو ہیں۔ لڑکی کو اپنی پراپرٹی سمجھتے ہیں۔

بس جہاں مجھے یہ ذرا سا شائبہ گزرا کہ مجھے پراپرٹی سمجھا جا رہا ہے میں وہاں ایک منٹ نہیں رہ سکتی۔ ابھی تک ایک ایرانی، ایک افریقی اور ایک عربی میری زندگی میں آئے ہیں۔ ان میں افریقی مجھے زیادہ پسند آیا۔ یہ لوگ بہت والہانہ محبت کرتے ہیں۔"

"اور کوئی جرمن نہیں آیا اب تک؟"

"ہاں ایک بڑی کوشش کر رہا ہے۔ اُسے میں نے آخر میں رکھا ہوا ہے۔"

"کیا مطلب ؟"

"مطلب یہ کہ عشق سے فارغ ہو کے جب شادی کروں گی تو اُس سے۔"

"یہ تو انٹرنیشنل لینڈ سکیپ معلوم ہوتا ہے۔"

" وہ تو میں نے شروع میں آپ سے کہہ دیا تھا کہ اپنے وطن کی خدمت کافی ہو چکی، اب اپنے لئے جینا شروع کیا ہے۔"

اُس نے شازیہ میں دلچسپی سی محسوس کی۔ وہ شعر و ادب کے علاوہ موسیقی کی بھی اچھی سمجھ رکھتی تھی۔ اس کا اندازہ اُسے تب ہوا جب اس محفل میں ستار کی آواز پر جو بیک گراؤنڈ میں مسلسل آ رہی تھی وہ خوبصورت مقامات پہ اپنا سَر ہلاتی اور بے ساختہ اُس کے منہ سے تعریفی جملے نکل پڑتے۔ اس نے شازیہ سے کہا۔ تم مجھے بڑی دلچسپ لڑکی لگی ہو۔ کیا ہم ایک دوسرے کے دوست نہیں ہو سکتے ؟"

اس نے کہا کہ آپ کا ایک ہینڈی کیپ آپ کے ساتھ ہے وہ یہ کہ آپ بھی اُسی سرزمین کے باشندے ہیں جہاں کے مردوں سے اب مجھے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔"

"لیکن ہم دوست کی حیثیت سے تو مل سکتے ہیں ؟"

"کیوں نہیں، مگر ابھی میرے پاس اس کے لئے وقت نہیں۔ مکالمہ تو آج بہت ہو گیا، باقی ملاقاتوں میں بھی مکالمے ہی ہوں گے۔ یہ مجھے اچھے بھی لگتے ہیں مگر کبھی کبھی۔ ان دنوں میں عشق میں گردن تک پھنسی ہوئی ہوں

——— پھر اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔

شازیہ کے پاس تو اب اپنے ہم وطنوں کے لئے دوستی کی فرصت نہ رہی

تھی اور فرح نے تے اُسے نظروں ہی نظروں میں جھٹک دیا تھا۔ اُسے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ وطن بھی قربت کے لئے اتنا مضبوط رشتہ نہیں جتنا کہ سیاست کی زبان میں بتلایا جاتا ہے۔ اُس کا ایک اور بُت اس ملاقات میں گر گیا۔

چند سال بعد اُسے پتہ چلا کہ شازیہ نے بالآخر اُس جرمن کو اپنی زندگی میں مستقلاً داخل کر لیا اور یوں بالآخر اپنے لئے جینے کا صلہ پالیا۔ شازیہ کی باتیں بہت دیر تک اُسے پریشان کرتی رہیں۔ اُس نے محسوس کرنا شروع کر دیا کہ لینڈ سکیپ زندگی کا راستہ متعین کرنے میں اہم رول ادا کرتا ہے۔ یہ حقیقت کہ آپ افریقہ کے کسی جنگل میں پیدا ہو گئے۔ یا کسی دور دراز پہاڑی علاقے میں جہاں تہذیب بھی نہیں پہنچی تو پیدائش ہی سے اس ماحول کی مجبوریاں اور محرومیاں آپ کی زندگی کا حصہ بن گئیں۔ وہ بچہ جو اس سے مختلف معاشرے میں پیدا ہوتا ہے، اُسے پیدا ہوتے ہی زندگی کی وہ سہولتیں اور نعمتیں میسّر آنے لگتی ہیں جو شخصیت کی تعمیر میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ شازیہ کا لینڈ سکیپ بدل گیا تھا اور اُس کے ساتھ ہی اُس کی زندگی کا نکتۂ نظر بھی۔ اس نے سوچا کہ لینڈ سکیپ میں رنگ تو سوچ اور فکر سے بھرے جاتے ہیں اور لینڈ سکیپ صرف جغرافیہ نہیں ہوتا یہ تو انسانوں کی فکر اور تخلیقی سرگرمیوں سے وجود میں آتا ہے۔ فکر کی آزادی نہ ہو تو پہاڑ زمین پر بھاری لگنے لگتے ہیں، ہوائیں بوجھل ہو جاتی ہیں اور تخلیقِ فن پہ پہرے لگا دیئے جائیں تو سبزہ خشک ہو جاتا ہے، نمی غائب ہو جاتی ہے اور ایک سرسبز زمین، ریت کے بے آب و گیاہ دشت میں بدل جاتی ہے۔ لینڈ سکیپ تو انسانوں کے اندر ہوتا ہے۔ پھر اُس نے اپنے آپ پہ نظر ڈالی تو اُسے محسوس ہوا کہ وہ سرسبز پہاڑوں، جھیلوں اور ہرے جنگلوں کے درمیان، سینے میں ایک صحرا لئے ہوئے جی رہا ہے۔ جہاں جُھلسا دینے

والی ہوائیں چل رہی ہیں اور اُس دشت میں فکر اور سوچ کے جلے ہوئے پنجر جگہ جگہ گرے پڑے ہیں۔

اُس نے آسمان کی طرف دیکھا تو ایک گِدھ اُڑتی ہوئی نظر آئی۔ دشت میں گِدھ کا اُڑنا تو کسی زندگی کے تازہ تازہ دم توڑ دینے کی علامت ہے۔ گدھ تو مُردار کی خوشبو پر آتی ہے۔ اُس نے سوچا کہ وہ پرندے کہاں اُڑ گئے جو پہاڑوں، جھیلوں اور ہرے جنگلوں کے درمیان چہچہاتے تھے اور اُن کے گیتوں کی صداؤں سے لینڈ سکیپ میں سُر کے جھرنے پھوٹنے لگتے تھے۔ لیکن پرندے تو جہاں پانی، سبزہ اور جنگل نہ ہو، وہاں سے کوچ کر جاتے ہیں۔ وہ بے رنگ اور فیض سے خالی زمین میں نہیں رہ پاتے، وہ اس لینڈ سکیپ میں جھلس جاتے ہیں اور دم توڑ دیتے ہیں رنگوں، سُروں، پانیوں، ہری شاخوں اور پھولوں سے خالی ہوتی ہوئی لینڈ سکیپ سے وہ سخت دہشت زدہ ہوا۔ اُس کا جسم جلتی ہوئی گرم ہوائیں جھُلسنے لگا۔ لیکن باہر کے لینڈ سکیپ سے بھاگ کے اب وہ کہیں نہیں جا سکتا تھا اور وہ بھاگنا چاہتا بھی نہیں تھا، وہ اس لینڈ سکیپ ہی میں پیدا ہوا تھا اور اُس کا حصّہ بن چکا تھا کہ اب ہر لینڈ سکیپ اس کی پہچان بن گیا تھا، وہ اس پہچان کو چھوڑ کر اب کہاں جا سکتا ہے؟ پہچان بھی تو پیدائش کی طرح ایک مجبوری ہے۔

گرد آلود سُرخ آسمان پر گدھ منڈلا رہی تھی اور نیچے بے آب و گیاہ دشت تھا۔ اس لینڈ سکیپ میں زندگی کہیں دکھائی دیتی تھی تو وہ اُڑتے ہوئے گدھ میں تھی جو موت کی علامت تھی۔ زندگی اب اس دشت میں اپنے آپ کو پا کر اس دریا کی طرح دم توڑ رہی تھی، جو آہستہ آہستہ ریت میں جذب ہو جاتا ہے۔

پر اُس کہانی کا کیا ہوا جو جھلک دکھا کے غائب ہو گئی تھی؟ یاد آیا کہ وہ کہانی تو ابھی شروع ہی ہوئی تھی کہ جلد ہی ایک دشت میں اُتر گئی اور دیکھتے دیکھتے

ریت میں جذب ہو گئی۔ جب تک وہ سبزہ زاروں میں بہہ رہی تھی تو اُس میں زندگی کے عکس جھلکتے تھے مگر جب ریت کے صحرا میں آئی تو اس میں دفن ہو گئی اور سمندر کا حصّہ نہ بن سکی۔ اس کا مُقدّر دشت میں بہتے ہوئے دریا کا مُقدر تھا جس میں آخری عکس اُس گدھ ہی کا تھا جو گرد آلود سُرخ آسمان پہ منڈلا رہی تھی۔

لکھنے والے کی کہانی

لکھنے والے کی کہانی

باتیں نچھی کی ۔ تحریر مختار صدیقی کی

کہنے لگے ۔

اخلاق سے پیش آنا بہت ضروری سماجی فعل ہے، غالباً یہ میں بھی جانتا ہوں، ممکن ہے تمہارے نزدیک مجھ میں "کلچر" اور "پالش" کی کمی ہو۔ لیکن یہ بھی سوچو کہ جس شخص کی آواز ہی، روح کو زخمی کر دے، اُس کا کیا کروں؟ ـــــ تم اُسے نازک مزاجی یا تنگ ظرفی کہہ کر خوش ہو لو، ـــــ لیکن یہ دونوں کا ہنگام نہیں ـــــ بلکہ میں تو اکثر سوچتا ہوں کہ آخر رُوح پر مختلف قسم کا کوہِ گراں بوجھ ہم، ہر ہر لمحے لادتے رہتے ہیں۔ اس کا نہ کوئی ذاتی فائدہ ہے نہ سماجی ـــــ پھر آخر کیوں یہ ـــــ"

مُنیر کی آواز رفتہ رفتہ مجھ سے دور ہو رہی تھی، کیونکہ لہجہ اب دھیما ہو گیا تھا، وہ اُٹھ کر کھڑکی سے باہر بادلوں سے ڈھکے ہوئے سلیٹی آسمان کو بے حد حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

اور اُن کی باتوں میں نہ کوئی تلخی رہی تھی نہ کوئی مرکزی خیال — اب رُوح کی حسرتناکی کا بیان تھا اور اُن کی آنکھیں انجانے غموں کے خون سے بوجھل تھیں،

میں نہیں جانتی، وہ کس وقت بات کہتے کہتے خاموش ہو گئے۔ میں اُسی طرح سر جھکائے سوچ میں تھی، بس ایک خیال تھا میں نے ایک معمولی سوشل ملاقات کیلئے کیوں ضد کی؟

یکایک کمرے میں علی اکبر خان کے سرود کی آواز گونجی، اب ہر طرف نغمے تھے۔ سرود کے موٹے تاروں کی گونج اور گمک، جو دل کی دھڑکن کو اپنے آپ میں سمو رہی تھی، اور پتلے پنچم کے تاروں کا کرب — دونوں مل کر ایسی پُراسرار گہرائیاں ان جانے اتھاہ غار آنکھوں کے سامنے لا رہے تھے کہ خوف اور لذّت فضاؤں میں بھر گئے۔

میں اب وہاں نہ تھی، فقط یہ نغمے تھے اور منیر —

دھیان کی لہریں آتی ہیں اور مٹ جاتی ہیں۔ یکایک آنگن ننھے بابا کی کلکاریوں سے گونج اُٹھتا ہے۔ وہ اپنی آیا سے بہت مانوس ہو گیا، اور یہ چاہتا ہے کہ اس کی آیا اُسے وہی کہانی سنائے جو کل رات اُسے منیر نے سنائی تھی — وہ بے چاری نہیں جانتی کہ منیر نے بابا کو کیا کہانی سنائی تھی، وہ آئیں بائیں شائیں کر کے بچے کو ٹال رہی ہے۔ بابا اُسے نہیں بتا سکتا کہ کہانی کیا تھی، میں بھی نہیں بتا سکتی، ان دونوں کی کوئی مدد نہیں کر سکتی کہ وہ کہانی کیا تھی،

منیر سے پوچھا جائے، اگر کوئی پوچھ سکے تو — کہ وہ کہانی کیا تھی، تو وہ خود بھی نہیں بتا سکیں گے،

کیونکہ کہانیاں، لکھی، بے لکھی، کہی اَن کہی کہانیاں، ہر ہر سانس منیر کے ساتھ ساتھ سانس لیتی رہتی ہیں — بہت سی ایسی کہانیاں میں نے اُن کی آنکھوں میں

پڑھی ہیں، بہت سی ایسی کہانیاں، اُن کی بلا وجہ اُکتا دینے والی خاموشیوں نے مجھ کو سنائی ہیں۔

یہ کہانیاں آتی رہتی ہیں، جاتی رہتی ہیں' ــــ میں نے دیکھا ہے کہ جب کسی کلاسیکی گانے کا کوئی ٹکڑا وہ بظاہر بے خیالی کے عالم میں گنگنا رہے ہوں یا بے حد ذوق و شوق کے ساتھ، کسی کتاب کے مطالعے میں مستغرق ہوں، کہانیوں کی ایک چھوٹی سی بدلی میں نے اُن کے گرد منڈلاتے ہمیشہ دیکھی ہے ــــ یہ شاعری نہیں، میری آنکھوں کا قصورِ بصارت نہیں، اور کوئی "ہیرو ورشپ" نہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ کہانیوں کا تانا بانا، اُن کے گرد اُلجھتا سُلجھتا رہتا ہے۔

مگر اِن کہانیوں کے عام ہونے کا موقع، سامنے لائے جانے کا ہنگام کیوں نہیں آتا ــــ؟

میں جب یہ سوال پوچھتی ہوں۔ تو ہر شوہر کی طرح وہ اپنے آپ کو بیوی کے "جواب دہ" پاکر، چڑ سے جاتے ہیں، میرا سوال اُن کو بُرا لگتا ہے، کیونکہ اس کے الفاظ اس کا اظہار، عام، پیش پا افتادہ، فرسودہ لفظوں میں ہوتا ہے ــــ یعنی:

بہت دن ہوگئے آپ نے لکھا کچھ نہیں؟ کچھ لکھئے نا؟"

یا اسی کے قریب قریب اور الفاظ ــــ کیونکہ میرے اصل جذبے کے لئے یہ الفاظ نہ صرف ناموزوں ہیں بلکہ اس کو غلط طور پر پیش کرتے ہیں ــــ مگر میں کہوں تو تو کیا کہوں۔ آخر باہمی مفاہمت بھی کوئی چیز ہے کہ نہیں ــــ میرا موقف یہ ہوتا ہے کہ منیرؔ کو یہ سمجھنا ہی چاہیے کہ جب اتنی ساری کہانیاں اس کے گرد منڈلا رہی ہیں' تو وہ اِن میں سب نہ سہی، کم از کم دو چار تو لکھ چھوڑیں، ورنہ کیا فائدہ ہے ــــ؟

اور منیرؔ کا مؤقف یہ ہوتا ہے کہ اس بیویوں والے سوال کا کیا جواب دیا جائے بھلا، نہ ہر کہانی لفظوں میں "پکڑی" جا سکتی ہے، نہ ہر دن، کہانی لکھنے کا دن

ہوتا ہے، نہ ہر کہانی لکھنے کا وقت اور جگرا کسی کے پاس ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ لکھنے کے معاملے میں وہ بے حد کاہل اور سست رفتار ہیں، اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ان کی "کہانی سازی" محض فکشن نہیں، میں نے مختصر افسانے کے لوازم پر ان سے بحث بھی کی ہے، وہ کہتے ہیں۔ "افسانہ" وہی نہیں، کہ جس میں محض تھیم - پلاٹ - کردار (اور مکالمہ اور بیان واقعہ) وغیرہ ہو، آخر یہ کیوں افسانہ نہیں کہ حضرت امیر خسرو کے بعد، ایمن کلیان جو رائج ہوا، تو اس میں کلیان ٹھاٹھ کے سُروں کا لگاؤ، ایسا کیوں ہے، جیسا کہ اب ہے اور یہ کیوں افسانہ نہیں کہ مولوی نور محمد نے، سکھ گردی کے زمانے میں، علی پور والے چیٹھہ سرداروں اور سکھ سرداروں کی لڑائیوں کا جو حال پنجابی شاعری کی بے نظیر صنف "وار" کی صورت میں لکھا ہے، اس پر "کچھ" لکھ دیا جائے؟ اور یہ کیوں افسانہ نہیں کہ زندگی کے بارے میں میرے نظریات کیا ہیں، اور یہ کیوں افسانہ نہیں کہ میں نے صرف ایک شام کا تأثر محسوس کیا اور جیسے مجھ سے میرے ذوق نے اِسے لکھوایا، میں نے لکھ دیا —— وغیرہ وغیرہ؟

اسی لئے وہ مصر ہیں کہ انہوں نے موسیقی، مصوّری اور دوسرے موضوعات پر جو مضامین لکھے ہیں۔ وہ بھی افسانے ہیں۔

مضامین کا لفظ میں نے ڈرتے ڈرتے استعمال کیا ہے۔ کیونکہ زبان کے معاملے میں ان کی باتیں بھی اپنی ہیں، مثلاً ان کے مضامیں، "مضامین" کے لب و لہجے سے عاری، اندازِ بیان سے الگ اور زبان تک میں "مضامین" کی ذیل میں لانا بڑی ادبی جرأت مندی کا کام ہوگا۔

اِسی طرح ان کے افسانے ہیں، کہنے کو ان میں جدید بلکہ جدید تر "حقیقت پسندی"

اور "کھردرا پن" لائے جاتے ہیں، لیکن زبان کی نرمی اور سوچ، شاعرانہ فقرے احساس
کی مخصوص طرز کی ناز کی ــــ اور ہر جگہ ایک عجیب حسرت ناکی کی آنچیں!!

یا اللہ تو پھر نظمیں کیوں نہیں لکھیں؟ یہ کیا چکر ہے کہ ــــ
لفظے، ہم از حکایتِ شیریں شمردہ ایم   آں "قصہ شکر" کہ بہ پرویز گفتہ اند!

مجھے بہت دن ہوئے، غالباً رومین رولاں کا یہ فقرہ بہت چبھا تھا،
"ہر تخلیقی فنکار کی ذات میں ایک عورت بھی چھپی ہوتی ہے اور اسی کی
بدولت، وہ فنکار، ادب، شعر، مجسمہ اور تصویر کو جنم دیتا ہے ــــ"
میں جو عورت ہوں، بار بار یہ حقیقت پانا چاہتی ہوں، بار بار اس پرابلم کو اتھل پتھل
کرتی ہوں۔
اس شخص میں وہ تخلیقی جوہر یعنی عورت کہاں ہے، جسے میں پہچانوں اور پاؤں؟

دھیان کی لہریں اب جو اوپر ہیں، میں سوچتی ہوں۔ ان کے افسانوں میں ایک
سپردگی کا سا انداز ہے۔ تجزیہ ہے تو بے رحم نہیں، بیاں ہے تو اس میں ملس کی
سادگی اور تمنا سازی اسی طرح کی ہے، جس طرح میرے دل کی ان کہی باتیں۔ کردار
ہیں، تو وہ بھی ایسے کہ ان کا برتاؤ، شفقت کا سا، بلکہ ممتا کے انداز لئے ہوتے ہے۔
حتیٰ کہ تھیم اور موضوع تک وہ ہیں کہ شائد میری ہی آنکھوں سے دیکھے گئے ہیں!!

یوں کہنے کو جدید ادبی رجحانات میں جو خاص قسم کا کھردرا پن، ادبیت اور
زندگی سے قربت کا لازمہ سمجھا گیا ہے، ان کے ہاں نام کو نہیں ملتا ــــ بعض دفعہ
تو اس "نرمی" اور "ملائمت" کی فضا سے جی اُلجھنے لگتا ہے، مگر وہ کہتے ہیں کہ زندگی

کے تلخ رُخ، ہماری کمینگیاں اور ذلتیں ہماری حد درجے کی روپیہ پرستی (زر پرستی نہیں!) اور سخت نا اقداری ــــ قدم قدم پر ہمارے گرد و پیش ایسے ایسے مواقع SITUATIONS اور تصادمات مہیا کرتے ہیں کہ ہر وقت لکھنے والوں کی فوج قلم برداشتہ لکھتی رہے تو بھی اس قبیل کے افسانے ختم نہ ہوں، مگر کیا یہ سب افسانے ہوں گے؟

اور پھر وہ بے حد ذاتی سطح پر اُتر کر یہ سوال پوچھنے لگتے ہیں۔

"کہو تم ایسے افسانے پڑھنے یا سننے پسند کرو گی؟ کیا تمہیں ایسے افسانے ENTERTAIN کریں گے یا کچھ سکھائیں گے؟ یا تمہاری انفرمیشن (معلوماتِ عامہ) میں کچھ اضافہ کرتے ہیں؟"

اب بتائیے ذاتی سطح پر اُتر کر اگر کوئی اس قسم کے سوال آپ سے پوچھے تو کیا جواب ہوگا؟

اب ان کو یہ کون بتائے کہ ہر زمانے میں تنقیدی اقدار زندگی کے تقاضوں کی تابع ہیں، ایک فرد کی پسند ناپسند کوئی معنیٰ نہیں رکھتی ــــ ادب کے تقاضے، اگر یہ نہیں کہ زندگی کی آئینہ برداری کی جائے۔

تو پھر قصہ طوطا مینا

اور طلسمِ ہوشربا میں کیا خرابی تھی بھلا۔

مگر وہ کہتے ہیں کہ میں آج کل کی زندگی

آج کل کے مسائل، آج کل کی اُمنگوں آج کل کے تقاضوں سے کہاں اور کس جگہ اغماض برت رہا ہوں؟

یہ ہے بھی ٹھیک۔ ان کی تحریروں میں زمانے اور ماحول کا بھرپور عکس موجود ہے، ہمارے گرد و پیش، ہمارے پرابلم، ہماری نفسیاتی اُلجھنوں ہماری اُمنگوں کی آئینہ داری ہر جگہ ہے، لیکن پھر وہی مسئلہ ہے کہ کس طرح؟

"اس کس طرح" کے سلسلے میں وہ کہتے ہیں، میں فن کو صحافتی جانب داری سے علیحدہ کروں یا نہیں؟

اگر موضوعات یعنی تھیم، یعنی پلاٹ اور کرداروں کے سلسلے میں میرا رویہ ایک رومانٹک کا سا ہے، تو خدا کے لئے یہ بھی دیکھو اس رومانٹک کے ساتھ اس کے نقطۂ نظر کی سخت "اذیت ناکی" بھی موجود ہے جو حقیقت پسندی کا لازمہ ہے۔

زندگی کا ہر لمحہ مائیں، نئے لمحے کی توقع میں گزارتی ہیں۔

کیونکہ اُن کو اپنے آپ میں کم اور اپنے بچوں کے قالب میں زندہ رہنا پڑتا ہے، اس سے بہت کم وقت بچتا ہے اور جو بچے، اُس میں اپنا خیال، یعنی ذات کا شعور و احساس کرنے کا لمحہ کم کم ہی آتا ہے

میں سمجھتی ہوں، جو شخص لکھنے میں اپنے آپ کو پوری سنجیدگی سے اُلجھائے۔ اُس کی صورت بھی کسی نہ کسی حد تک ماؤں کی سی ہوتی ہے، یا کم سے کم ہو جانی چاہیئے کہ وہ اپنی موجودہ تحریروں (جو لکھی جا چکی ہیں) کا ہر آن اسی طرح ذمّے دار نگران اور گارڈین ہو، جس طرح ماں ایک بچے کے لئے ہوتی ہے اور آئندہ تحریروں کے ذہن میں آنے اور اُن کے جنم دینے اور پھر اُن کی غور و پرداخت، نگرانی اور تہذیب و تربیت کے مراحل بھی اس کی نظر میں ایک ساتھ رہنے چاہئیں۔

مگر لکھنے والوں میں یہ بھونڈا پن اور بے وفائی عام دیکھی کہ جو چیز لکھی گئی۔ بس ختم ہوئی، اس کی نگرانی، ذمّے داری اور تہذیب و ترتیب سے واسطہ بہت کم رکھا گیا اور جو کچھ لکھنا ہے۔ بس اس کا بھی چاؤ، جو چلا چند دن کا —— اور پھر آگے چل دیئے کہا تو یہ کہا کہ آرٹسٹ کبھی اپنی تخلیق سے مطمئن نہیں ہوتا —— اس لئے ہر آن نئی منزلوں

کی تلاش میں رہتا ہے نئے خیالات، نئے تأثرات، نئے اندازِ بیان، نئے لہجے، نئے امیج اور نئے مقاصد ـــــ

کیونکہ وہ لوگ کہتے ہیں کہ آرٹسٹ کی فنی تخلیقات میں ارتقا کا عمل جاری و ساری رہتا ہے۔ اگر آرٹسٹ اپنے ماضی میں اُلجھا رہے، تو آگے کی فکر کیسے کرے گا؟

مگر یہ بھی اسی رویے کا شاخسانہ ہے کہ اکثر و بیشتر لکھنے والے بعض دفعہ جو کچھ تخلیق کر جاتے ہیں نہ پھر اُن بلندیوں کو کبھی چھوتے ہیں۔ نہ اس کے انداز و بیان میں پھر وہ رعنائی، وہ بھرپور پن پھر کبھی آتا ہے اور زیادہ تر وہ اپنے آپ کو اپنے تجربات و مشاہدات کو یا اپنے تعصبات کو دُہراتے ہی رہتے ہیں

شاعروں کو دیکھیے، افسانہ نگاروں کو پڑھیے، تنقید نگاروں کو چھانیئے، اکثر یہ ملے گا کہ چند باتیں اصل ہیں، باقی ہیر پھیر کر دہرانے کا عمل جاری رہتا ہے۔

مینر نے کہا ـــــ مائیں بھی یہی کرتی ہیں، ایک آدھ بچہ کام کا پیدا کیا، باقی وہی ایک ہی سانچہ میں ڈھلی سیکنڈ اور تھرڈ کلاس مصنوعات

مگر ـــــ

یہ تقابل، یہیں ختم ہونا چاہیے،

نہ تو آرٹسٹ اُن معنوں میں ماں ہے، جن معنوں میں ایک ماں، میں ہوں اور میری اَن گنت بہنیں ہیں اور نہ ہر فنی تخلیق ان معنوں میں "اولادِ سعید" ہوتی ہے۔ جن معنوں میں ہم لوگ اپنے ماں باپوں کی نیک نامیوں کا جھنڈا اُٹھائے پھرتے ہیں۔

بہت دن ہوئے ایک شعر ریاض کا کسی نے سنایا تھا۔

میرے مولا نے مجھے بخشی ہے اولادِ سعید　　میرے اشعار وہ ہیں جن سے مرا نام چلے!

تو بس فنی تخلیقات اسی حد تک اولاد ہیں کہ اُن سے فنکار کا نام چلتا ہے ـــــ

باقی مماثلت کچھ زیادہ نہیں اور اگر ہے تو فقط نام کی ـــــ

اِسی لئے فنکار میں ایک خاص قسم کی بے رحمی اور سنگ دلی میں نے عام دیکھی اور سُنی تھی، مگر صحیح اندازہ، میر کے پاس رہ کر ہوا ——

میں نے یہ دیکھا ہے کہ ان کی باتوں، آنکھوں کی حسرت ناکی اور انداز کی بے بسی کے گرد افسانے منڈلا رہے ہیں، لکھے جانے کے لئے بیتاب ہیں، وہ خود اس کرب کو آسودہ کرنے کے لئے سخت مضطرب ہیں، لیکن جب فرصت پاکر، خاموشیوں کا حکم دے کر لکھنا شروع کیا، تو کیا لکھا گیا۔ محض کوئی مضمون !!

اور میں نے دیکھا ہے کہ کسی خیال، یا تاثر کو انہوں نے زبان دی،

اس کا منظر و پس منظر تک مجھ سے ڈسکس کیا، اور یہ سب کچھ اُردو میں تھا، اور جب لکھا تو پنجابی میں —— اور میں نے دیکھا ہے کہ پورے افسانے انہوں نے مجھ کو سنائے، اب کسر اتنی تھی کہ ان کو مناسب طور پر ایڈٹ کر کے "ادبی زبان" میں لکھ جائے، لیکن جب لکھنے کا موقع آیا، تو اُنہوں نے محض ٹیلی ویژن پروگرام دیکھنے پر اکتفا کی، یا ایک طویل خاموشی میں مراقبہ فرمانا ہی مناسب سمجھا، اور بس،

شعورِ ذات پر وہ بڑا زور دیتے، اور کہتے ہیں کہ انسان لکھتا بھی ہے تو شعورِ ذات کا ایک حیلہ ہی ڈھونڈ رہا ہوتا ہے۔ شعورِ ذات کا یہ شعور اور اس کی ضرورت و اہمیت غالباً تقاضا ہے، اُن کی ذہنی اور دنیاوی پس منظر کا —— کہ

ایک شخص کو مختلف علوم کے ساتھ شغف تھا، مگر اسے پولٹیکل سائنس میں تخصیص حاصل کرنی پڑی اور پھر اسی مضمون کو زندگی کے بہترین سال پڑھانا بھی پڑا۔

اور —— وہ کسی وجہ سے موسیقی کا رسیا تھا کہ اُسے اپنے ایک بزرگ کی رفاقت اور شفقتِ خاص کی بدولت موسیقی کے فنی اور عملی، حسن کارانہ اور تاثراتی پہلوؤں سے آشنائی کا موقع مل گیا اور —— اس شخص نے ادب و شعر میں اپنی دلچسپیوں کو نہ

موسیقی میں گم ہونے دیا، نہ پولیٹیکل سائنس کی خشک نظریہ سازیوں میں کھلانے دیا۔

اور صوفیانہ ذوق کی چاشنی خاص ماحول کا اثر تھی، یہ پہلے ہی ایسا دل لے کر پیدا ہوئے تھے، پھر چند دوست بھی ایسے مل گئے کہ "دیوانہ را ہوئے بس است" اب داتا حضور کے دربار میں حاضری دے کر جو کیفیات یہ بیان کرنا چاہتے ہیں، ان کے لئے لفظ کہاں سے آئیں!

اور — یہ کہ کچھ لوگوں نے اِن کی باتوں میں جادو، ان کی محبت میں شاعری ان کی عادتوں میں اتنی دلکشی دیکھی کہ خطوط اور ملاقاتوں اور وعدے وعید کے دفتروں کو کھولا بھی — اور یہ سب شعورِ ذات کے لئے ٹانک ٹوپیے ہیں۔ مگر اپنے آپ کو جان لینا بہت بڑی منزل ہے اور جان لینے سے ہی سب مرحلے طے نہیں ہوتے۔

خیر یہ بحث تو لمبی ہے، لیکن کہنا یہ تھا کہ شعورِ ذات کے جو حیلے تحریروں میں انہوں نے اپنائے ہیں، انہوں نے ان کو ایک خاص طرح کا بے حد "CONSCIOUS" آرٹسٹ بنا دیا ہے۔ ہر جگہ لئے دئیے رہنے کی سی کیفیت، سنبھلنا، سنبھالنا — جیسے گیلری کے سامنے کمالِ فن کا اظہار — کسی جگہ وارفتگی، اور والہانہ پن نہیں۔ نپی تلی بات اور انداز، — خبردار — خبردار، کوئی "تعصب" کہیں در نہ آئے، کہیں ایسا نہ ہو کہ جذباتیت جھلکنے لگے، کہیں یہ نہ ہو کہ محض فنی کرشمہ سازی کا پڑھنے والے کو گمان گزرے کہیں اکتاہٹ طول گوئی کا دامن نہ تھام لے وغیرہ

اور اس "پاسبانِ عقل کو وہ ہر جگہ اپنے ساتھ لئے پھرتے ہیں،

"دل پر اختیار" کی یہ وہ قسم ہے۔ جس پر اُن کو ناز ہے اور اُسی کو وہ اپنی فنکاری میں سمونے اور اُبھارنے کی ہمیشہ کوشش کرتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ے

ہر زماں در آستیں دارد خداوندے دگر

پہلا دن : ۱۵ مئی ۱۹۳۲ مقام : گوجرانوالہ (پنجاب)
نام کہ جس سے پکارے گئے : منیر احمد شیخ
تعلیم جو ذریعۂ روزگار بنی : ایم اے (سیاسیات)

دھندے :

۱۹۵۶ء تا ۱۹۶۵ء	لیکچرار (سیاسیات)
۱۹۶۵ء تا ۱۹۷۵ء	مرکزی وزارتِ اطلاعات
۱۹۷۵ء تا ۱۹۸۲ء	وزارتِ خارجہ
۱۹۸۲ء تا حال	مرکزی وزارتِ اطلاعات

بہلاوے :

لفظوں کے کھیل کہ جن کی یہ صورتیں سامنے آئیں :

۱۔ لمحے کی بات (افسانے) ۱۹۷۰ء
۲۔ ق سے قلم تک (مضامین) ۱۹۷۶ء
۳۔ تہذیبی رویے (مقالات) ۱۹۷۶ء
۴۔ بہتے پانی میں عکس (افسانے) ۱۹۸۶ء
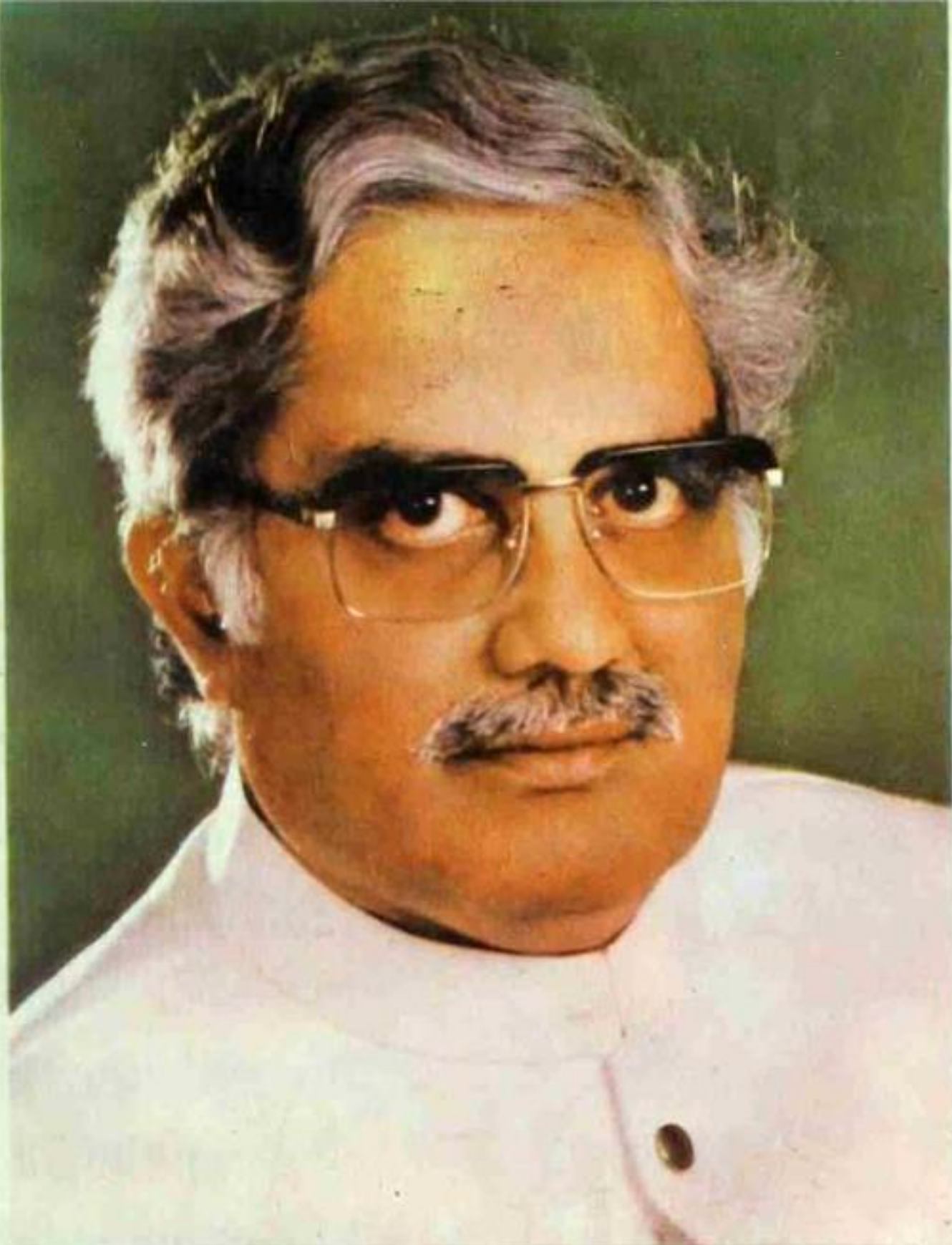
پناہ گاہیں :

سُر
صُورت
شعر اور
وُہ لوگ کہ جن کے وُجود سے اس مختصر زندگی کو خوبصورت لمحے میسّر آئے۔

ایک خواہش :

اُس لمحے کی جستجو جب جینے پر اپنا بھی اختیار ہوگا۔

تصویر : ضیغم زیدی